رجسٹرڈ نمبر اے ۲۶۶

نگار

قیمت ۸/

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

[illegible]

تصانیف نیاز فتحپوری

[illegible]

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۰۔ افسانے ۳۳ء کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان نزاکت تخیل در پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی ومعاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں سہ تصویر حضرت نیاز ۸۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخییل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشار عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعرا پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔

حجم ۱۰۰ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعرا کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

نگار

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بہ وجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

جلد (۳۷)	فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۴۶ء	شمار (۲)

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۲
عہد قدیم کا انسان کیا نہ جانتا تھا ---------- اڈیٹر ---------- ۹
کلام ماہر لکھنوی ---------- ع-ن ---------- ۱۴
اپنے ایک اشتراکی دوست سے! ---------- گلاب چند ---------- ۲۴
دنیائے آب کی کہانی ---------- اڈیٹر ---------- ۳۱
بڑا گھر ---------- شنکر سروپ بھٹناگر ---------- ۳۸
مخدوم کی شاعری ---------- محبوب حسین (عثمانیہ) ---------- ۴۳
قصاص کی کرسی ---------- اڈیٹر ---------- ۴۹
علم کی طیار کی ہوئی دوزخ ---------- اڈیٹر ---------- ۵۲
مکتوبات نیاز ---------- اڈیٹر ---------- ۵۵
جامعہ میں ایک مہمان کے ساتھ ---------- فضل الدین اثر ---------- ۶۱
باب الاستفسار ---------- اڈیٹر ---------- ۶۷
تنوعات ---------- اڈیٹر ---------- ۷۱
منظومات --- تمکین - فراق - نجم آفندی - خلیل اللہ قریشی - جگر - انجم - ابد - نبی احمد - بہار ---------- ۷۳

دفتر نگار سے ایک ہفتہ وار اخبار "جنگ" کا اجراء اشتہار صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیے

جنگ کے آیندہ امکانات (ملاحظات)

جنگ جہاں کہیں بھی ہو، خوفناک چیز ہے، لیکن یہ جنگ جتنی خطرناک ہے، اتنی ہی عجیب بھی ہے، اور "ہٹلر و اسٹالین" کے اتحاد نے، امکانات و قیاسات کی دنیا کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ ذہن انسانی مشوش ہو کر رہگیا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آیندہ کے متعلق کیا حکم لگائے

ہٹلر کے نقطۂ نظر سے

اسوقت قدرتاً ہر شخص کے دماغ میں یہ سوال چکر لگا رہا ہے کہ اس جنگ کا حقیقی مقصود کیا ہے اور روس کیوں یہ چاہتا ہے کہ جرمنی کامیاب ہو بعض کا خیال ہے کہ گزشتہ اگست میں مابین روس و جرمنی ایک سمجھوتا یوروپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے کا ہو چکا ہے جس کا نام حسب بیان رابن ٹراپ، آر پلین (R. Plan) ہے اس قیاس کے مطابق، یوروپ کے موجودہ جغرافیہ میں جو تبدیلی یہ دونوں چاہتے ہیں اس کو آپ نقشہ میں دیکھئے یعنی فن لینڈ اور ناروے کی سرحدوں کے نقطۂ اتصال سے ایک سیدھا خط جنوب کی طرف بحر روم تک کھینچا جائے اور اس خط کے مشرق پر جتنے ممالک ہیں وہ روس کے زیر اثر آجائیں اور مغربی جانب کے ممالک پر جرمنی کا اقتدار ہو جائے یعنی بالٹک ریاستیں، مشرقی پولینڈ، رومانیا، بلغاریہ اور یونان کا مشرقی حصہ، سوویٹ یونین میں شامل ہو جائے اور سویڈن، ناروے، ہنگری اور یوگوسلیویا اور مغربی یونان پر نازی حکومت کے اثرات قایم ہو جائیں

جن لوگوں نے یہ قیاس قایم کیا ہے وہ ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جرمنی کا روس کو اس بات کی اجازت دیدینا کہ وہ بالٹک ریاستوں اور فن لینڈ پر قبضہ کرے، بغیر اس سمجھوتے کے ممکن ہی نہیں کہ اس کے عوض جرمنی کا بھی کوئی حصہ مقرر ہو گیا ہوگا اور وہ حصہ "سویڈن و ناروے" ہو سکتا ہے یا ریاستہائے بلقان یا دونوں

اگر یہ کہا جائے کہ ہٹلر نے روس کے ان جارحانہ اقدامات کو صرف اس لئے منظور کیا ہے کہ وہ اس کے عوض روس سے خام پیداوار حاصل کریگا، تو یہ اس لئے درست نہیں ہو سکتا کہ اول تو روس کی خام پیداوار اتنی زاید نہیں کہ وہ کسی اور ملک کو فراہم کر سکے اور دوسرے یہ کہ جرمنی و روس کے درمیان ذرایع نقل و حرکت اس قدر خراب ہیں کہ جرمنی، روسی پیداوار سے کوئی فایدہ اُٹھا بھی نہیں سکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جرمنی نے سودا اچھا اور ہی کیا ہوگا اور وہ سوائے ریاستہائے بلقان اور سویڈن، ناروے کے کچھ نہیں ہو سکتا

اس لئے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جرمنی کا آیندہ قدم کیا ہوگا۔ جب تک فن لینڈ کا مسئلہ طے نہیں ہو جاتا اسوقت تک تو جرمنی یونہی خاموش بیٹھا رہیگا، لیکن روس جونہی فنلینڈ کو عبور کر کے ناروے کی سرحد تک پہونچے گا کہ بحیرۂ بالٹک میں جرمنی کی فوجی نقل و حرکت شروع

وسویڈن اور ڈنمارک (ریاستہائے اسکنڈی نویا) کے خلاف شروع ہو جائے گی ظاہر ہے کہ یہ ممالک جرمن افواج کا مقابلہ نہیں کرسکتے، اسلئے ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو بالٹک ریاستوں کا ہوا اور اس طرح بہت سی کارآمد معدنیں بھی جرمنی کے ہاتھ آجائیں گی اور بحر شمال میں وہ زیادہ آسانی سے ہلاکت پھیلا سکے گا

جب یہ ہو چکے گا تو پھر روس کی باری آئے گی اور وہ ریاستہائے بلقان کا رخ کریگا، جرمنی خاموش رہیگا یہانتک کہ روس کا پورا دباؤ ترکی پر پڑجائے اور جب جرمنی یہ دیکھ لیگا کہ ترکی کے اقدامات کو روس نے روک دیا ہے تو پھر وہ رومانیا، ہنگری اور یوگوسلیویا کو ہضم کرنے کیلئے دوڑ پڑیگا

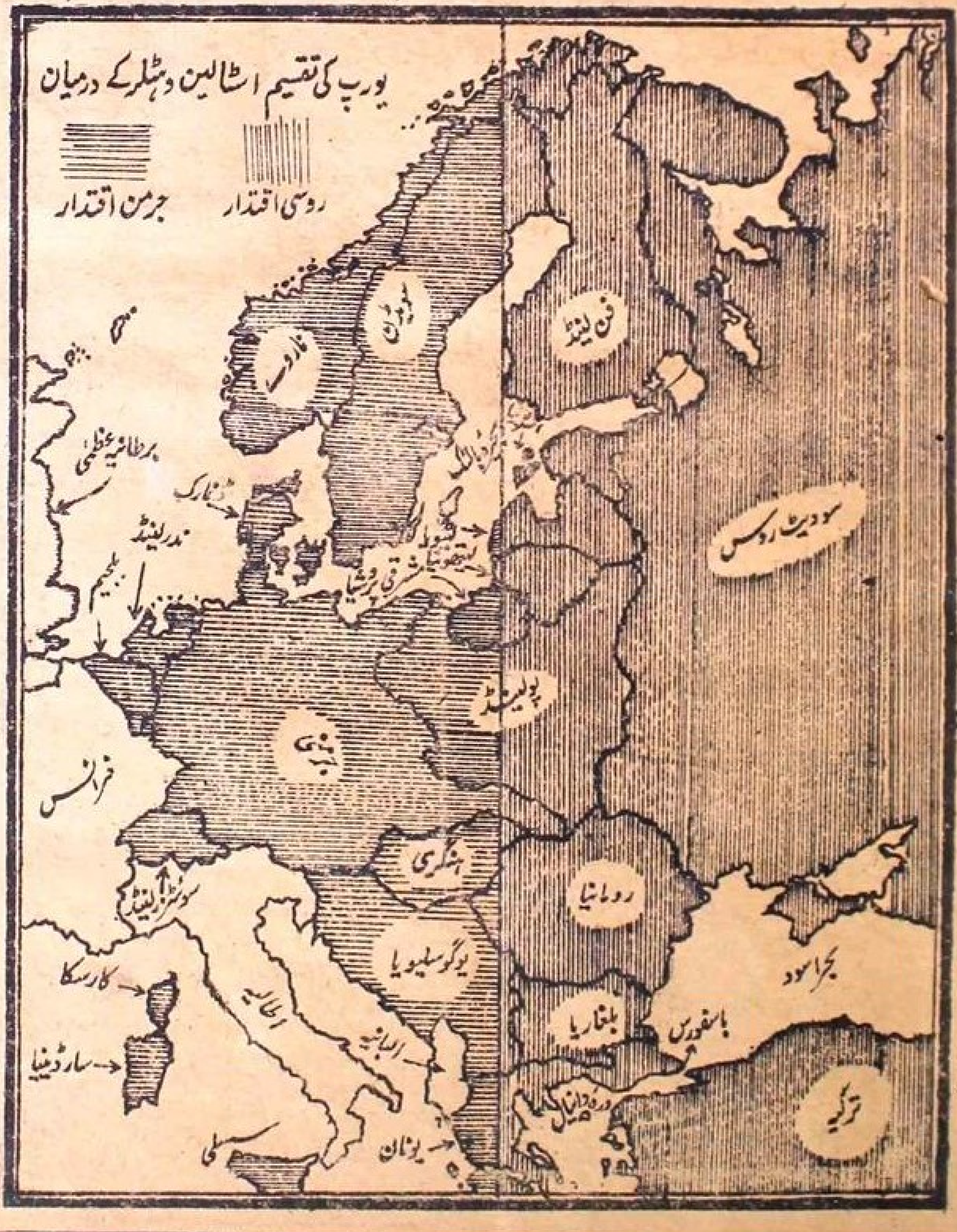

اس سلسلہ میں سب سے بڑا سوال اٹلی کے رجحان کا ہوگا، لیکن بظاہر اس کی کوئی امید نہیں کہ وہ روس و جرمنی کا ساتھ دیگا، کیونکہ ان کے ساتھ دینے سے اس کو پانے کی اتنی توقع نہیں جتنا اندیشہ کھو دینے کا ہے اور اس لئے قوی امکان اس بات کا ہے کہ فرانس و برطانیہ کے ساتھ اٹلی، اسپین اور ہنگری، کا بھی معاہدۂ اتحاد ہوجائے گا۔ ہر چند یہ ضروری نہیں کہ یہ تمام حکومتیں لڑنے ہی کے لئے طیار ہوجائیں

اسٹالین کے نقطۂ نظر سے

دوسری جماعت کا مطالعہ میجر جنرل فلر کی رائے کے مطابق ذرا اس سے مختلف ہے اور وہ اس جنگ کو جرمنی و اتحادیین کی جنگ نہیں قرار دیتی بلکہ اشتراکیت و غیر اشتراکیت کی جنگ قرار دیتی ہے۔ چونکہ روس سب سے بڑی بری حکومت ہے اس لئے وہ برطانیہ کو جو سب سے بڑی بحری قوت ہے، ہمیشہ حاسدانہ نگاہوں سے دیکھتی چلی آرہی ہے۔ علاوہ اس کے چونکہ روس، برطانیہ کو سرمایہ داری کا سب سے بڑا حامی بھی سمجھتا ہے، اس لئے دوسرا سبب عناد کا یہ بھی ہے

برطانیہ کے خلاف روس کی یہ برہمی لینین ہی کے وقت سے چلی آرہی ہے، جس نے کھلم کھلا اپنی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کردیا تھا کہ "لندن کا راستہ دہلی ہو کر گیا ہے" اور اب اسٹالین اس کی تکمیل جرمنی کے ساتھ شریک ہوکر کرنا چاہتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ اسٹالین نے اتنی گہری پالیسی اختیار کی ہے کہ ساری دنیا اس کے دھوکہ میں آگئی ہے۔ کچھ عرصہ سے برطانوی مدبرین یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسٹالین نے انقلابی پالیسی ترک کردی ہے اور اب وہ قدامت پرست جمہوریت کی طرف مایل ہوتا جارہا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اسٹالین بدستور انقلابی پالیسی کا حامی ہے اور مقصد برآری کے لئے وہ اپنے آپ کو بجائے سیاہ کے سفید دکھانا چاہتا ہے۔ ایکبار ۱۹۱۸ء میں لینین نے ظاہر کیا تھا کہ:۔ "اسوقت روس میں تو ہماری پوزیشن مضبوط ہے، لیکن اتنی طاقت ہم میں نہیں کہ بین الاقوامی ملوکیت کا مقابلہ کرسکیں، اسلئے ہماری پالیسی یہی ہوسکتی ہے کہ موقعہ کا انتظار کریں"۔ چنانچہ اس موقعہ کا انتظار ہوتا رہا یہاں تک کہ اب بہ وساطت جرمنی اس سے فایدہ اٹھانے کی کوشش ہورہی ہے

یہ خیال کہ روس اشتراکی اصول کو ترک کرتا جاتا ہے، صحیح نہیں اور اکابر روس نے ہمیشہ اس کی تردید کی ہے، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں وہاں کے سکریٹری جنرل ڈیمی ٹروف (Dimitroff) نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ:۔ "ہم پر یہ الزام قایم کیا جاتا ہے کہ ہم اشتراکی اصول سے ہٹتے جارہے ہیں۔ لیکن یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ ہم مارکس اور لینین کے صحیح پیرو ہو ہی نہیں سکتے جبتک موقعہ و محل کے لحاظ سے اپنی ترکیبوں میں تغیر و تبدل نہ کرتے رہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم بظاہر اشتراکی اصول سے ہٹتے ہوئے نظر آئیں، لیکن یہ بھی ہماری ترکیب ہوگی جس کے ذریعہ سے اشتراکی مقاصد کو پورا کیا جائے گا"

اب اسٹالین کی پالیسی پر غور کیجئے۔ اسٹالین اس خیال کو ظاہر کرچکا ہے کہ تجارتی مسابقت سے زیادہ کوئی چیز سرمایہ دار ممالک کو تباہ کرنے والی نہیں، اس لئے ان کو آپس میں لڑاتے ہی رہنا چاہئے۔ اپنے مقاصد کی توضیح کرتے ہوئے ۱۹۲۴ء میں اسنے ظاہر کیا تھا کہ "گزشتہ جنگ، جرمنی کو تباہ نہ کرسکی، بلکہ بغض و عناد کا بیج اس میں بوگئی اور فاتح قوموں کے خلاف ایسا شدید جذبۂ انتقام پیدا کرگئی جس کو دور کرنا ناممکن ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ کتنا بڑا فایدہ پہونچا گئی کہ روس کی سرمایہ داری ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ جو جنگ ہونے والی ہے اس کے نتایج ہمارے لئے اس سے بہتر نہ ہوں گے؟"

۲۴ اگست ۳۹ء کو روس کے مشہور اشتراکی اخبار پراوڈا (Pravda) نے اسٹالین کی اسی پالیسی کو دوسرے

الفاظ میں اس طرح ظاہر کیا تھا کہ :- "پہلی جنگ ملوکیت نے جب لوگوں کو اقتصادی تباہی میں مبتلا کیا تو اشتراکی انقلاب نے اسکا خاتمہ کیا اور اب اگر جنگ ہوگئی تو یوروپ وایشیا کی بہت سی سرمایہ دار حکومتیں انقلاب کا شکار ہونگی اور انکے سر سے بھی یہ عذاب دور ہوگا"

پراوڈا کے اس بیان پر ایک انگریز صحافی (Lancelot Lawton) نے لکھا تھا کہ :- "اگر پراوڈا کی یہ پیشین گوئی صحیح نکلی تو اسکے معنے یہ ہیں کہ سوویٹ جمہوریتیں، دریائے رھائن کے سواحل، بحر روم کے علاقوں اور مشرق بعید میں بھی قایم ہوجائیں گی اور یہ انجام بڑا دردناک ہوگا"

اسٹالین کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں سرمایہ دار حکومتوں سے کوئی بڑی لڑائی لڑنا نہیں چاہتا، چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۹۳۹ء کی تقریر میں اس نے ظاہر کیا تھا کہ :- "ہم کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مبادا دوسروں کے بھڑکانے سے ہم آگ میں پھاند پڑیں اور دوسرے اس سے فایدہ اٹھائیں"

اسی قسم کا خیال کامریڈ مخلس (Meklukm) نے ظاہر کیا تھا کہ "سرخ افواج کا مقصود تو صرف یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سوویٹ جمہوریتوں کی تعداد بڑھائی جائے، اور اس باب میں اسٹالین سے بہتر ناخدا اور کوئی نہیں ہو سکتا"

اس لئے اسٹالین کا ہٹلر سے مل جانا اس لئے نہیں ہے کہ وہ نازیت کو پسند کرتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اس سے ڈرتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پولینڈ کے مسئلہ میں یوروپین حکومتیں ضرور لڑیں گی اور آخر میں تباہ ہوں گی اور یہی وہ وقت ہوگا جب روس کو اپنی اشتراکیت پھیلانے کا موقعہ ملیگا۔ چنانچہ پولینڈ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہاں کی اشتراکی جماعتوں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ "ہمیں لڑائی سے علحدہ رہنا چاہئے، لیکن جب فریقین کمزور ہو جائیں تو ہمیں مداخلت کرکے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے"

ہٹلر خود روس و جرمن اتحاد کا حامی تھا، اس کا یقین تو نہیں ہو سکتا، لیکن جب برطانیہ نے پولینڈ کی حفاظت کی ضمانت لیلی تو اس کے لئے چارۂ کار صرف یہی تھا کہ وہ اسٹالین کو ملائے۔ ہر چند وہ اسٹالین کو اپنا دوست نہیں سمجھتا اور جانتا ہے کہ اس کا کیا ارادہ ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی واقف ہے کہ روس کی فوجیں، جرمنی فوجوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں اور اگر آخیر میں اسٹالین سے جنگ کرنا پڑی بھی تو فیصلہ جرمنی ہی کے حق میں ہوگا

بہر حال اسٹالین و ہٹلر کا اتحاد جو نوعیت بھی رکھتا ہو اس میں کلام نہیں کہ روس ابھی تک فایدہ ہی فایدہ میں ہے آدھا پولینڈ اس کو ملگیا، بالٹک ریاستوں پر اس کا قبضہ ہوگیا اور اگر فن لینڈ کو بھی اس نے فتح کر لیا تو بحر اٹلانٹک کی طرف وہ برطانیہ کے لئے بڑے خطرہ کی چیز ثابت ہوگا

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ فن لینڈ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ قیاس چاہتا ہے کہ اس کے بعد وہ کسی طرف اقدام نہ کریگا بلکہ لڑائی کا رنگ دیکھے گا۔ اگر اتحادیین کو کامیابی حاصل ہوئی - اور ظاہر ہے کہ اتحادیین کی اس کامیابی کا سبب ناکہ بندی ہوگی تو جرمنی کی اقتصادی حالت اتنی خراب ہو جائے گی کہ وہاں انقلاب پیدا کرنا آسان ہو جائے گا اور وہ جرمنی پر اسی آسانی کے ساتھ قابض ہو جائے گا جس آسانی سے پولینڈ اور ریاستہائے بالٹک پر قابض ہوا ہے اور جرمنی ایسے زبردست

ملک کا اشتراکی ہوجانا گویا سارے یوروپ کا اشتراکی ہوجانا ہے

اگر کامیابی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو بیشک اسٹالین کی پوزیشن نازک ہوجائے گی، کیونکہ جرمنی کا مقابلہ کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہے، علاوہ اس کے ایک بڑا سوال جاپان کا بھی ہے جو اسے جرمنی سے علحدہ نہیں کر سکتا۔

فرض کیجئے کہ برطانیہ کو شکست ہوئی تو کیا جاپان خاموش بیٹھا رہے گا اور اس کو تنہا فایدہ اُٹھانے دیگا، ہرگز نہیں، وہ فوراً جزایر فلپائن، ہانگ کانگ، فرانسیسی انڈوچائنا اور جزیرہ نمائے ملایا پر قبضہ کرکے برما اور ہندوستان کا رخ کرے گا اور پھر اس وقت روس، بغیر جرمنی کی مدد کے جاپان کو ہندوستان کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔

بلقانی ریاستوں کو سامنے رکھ کر آپ نے بحث کے دو پہلو مطالعہ کرلئے، لیکن ایک تیسرا پہلو اور بھی ہے، وہ یہ کہ اس جنگ کا اثر ریاستہائے بلقان پر کیا پڑے گا اور سیاسی و اقتصادی نظر سے فریقین کے وہ کونسے اغراض ان ریاستوں سے وابستہ ہیں جو استحوان جنگ ثابت ہوسکتے ہیں

ریاستہائے بلقان (یعنی ہنگری، رومانیا، یوگوسلیویا، بلغاریہ) کا جائے وقوع ایسا ہے کہ نہ جرمنی ان سے بے نیاز ہوسکتا ہے اور نہ وہ جرمنی سے۔ کیونکہ ان ریاستوں کی خام پیداوار کا نصف حصہ جرمنی ہی کے کام آتا ہے اور جرمنی کی صنعتی ترقیاں رُک جائیں اگر یہاں سے لوہا، تانبہ، تماکو، لکڑی اور پٹرول وغیرہ کی برآمد بند ہوجائے۔ جرمنی یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ یہ ریاستیں صنعت و حرفت میں ترقی کرکے بازاروں میں اپنی جگہ علحدہ پیدا کریں وہ چاہتا ہے کہ یہ ریاستیں صرف خام اشیا پیدا کرکے جرمنی کی ضروریات کو پورا کرتی رہیں اور وہ ان ٹھوس کارآمد چیزوں کے عوض میں انھیں آئینہ، کنگھا، تیل، غازہ وغیرہ تکلفات کی چیزیں فراہم کرتا رہے وہ ان کو اپنی مستعمرات یا نوآبادیاں سمجھتا ہے اور یوروپ کی کسی اور سلطنت کا دخل یہاں گوارا نہیں کر سکتا۔ علاوہ اس اقتصادی سبب کے اس کی سیاسی اغراض بھی ان ریاستوں سے وابستہ ہیں

روس کے تعلقات، ریاستہائے بلقان سے اقتصادی نہیں ہیں کیونکہ خام پیداوار کی خود اس کے یہاں بھی کمی نہیں، لیکن بلغاریا اور یوگوسلیویا کی سلافی آبادی سے اس کے جذباتی و روایاتی تعلقات بیشک دیرینہ ہیں، کیونکہ اُنیسویں صدی میں بلقان کی سلافی آبادی نے جب ترکی اور جرمنی کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو روس ہی نے ان کی مدد کی تھی۔ علاوہ اسکے اس کا سیاسی تعلق بھی سرزمین بلقان سے کم نہیں ہے، کیونکہ اوکرائن، کریمیا اور قفقاز پر اس کا تسلط اسی وقت قایم رہ سکتا ہے جب بحر اسود (Black Sea) خطروں سے پاک رہے اور آبنائے باسفورس کا تعلق سرزمین بلقان ہی سے ہے

ہرچند قیام بالشویت کے بعد، روس کے اثرات بلقان میں کم ہوگئے ہیں، لیکن بلغاریہ اور یوگوسلیویا کی سلافی آبادیاں ابتک روس کی طرف مایل ہیں اور اگر روس و جرمنی، دونوں بلقان کی طرف بڑھیں تو ہوسکتا ہے کہ کسی وقت یہاں کی سلافی آبادی، روس کی طرف مایل ہوجائے اور روس و جرمنی کے تعلقات اچھے نہ رہیں، لیکن اٹلی کا سوال اس سے زیادہ

اہم ہے اور وہ روس کا اقدام بلقان کی طرف کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ اٹلی بلقان سے دوگونہ تعلقات رکھتا ہے یعنی یہاں کی خام پیداوار بھی حاصل کرتا ہے اور بحر اڈریاٹک کے سواحل اور اپنے مستعمرات افریقہ کی حفاظت کے لئے بھی اس کے اثرات کا یہاں قایم رہنا ضروری ہے۔ اسی لئے اس نے ۱۹۳۹ء میں البانیہ پر قبضہ کر لیا کیونکہ البانیہ اور جزایر ڈوڈکنیز سے وہ ترکی اور یونان دونوں پر دباؤ ڈال سکتا ہے

اٹلی، بلقان میں اپنا قبضہ تو وسیع کرنا نہیں چاہتا، لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ بلقانی ریاستوں کا ایک اقتصادی بلاک ایسا بن جائے کہ جرمنی کا اقتصادی دباؤ اور روس کا سیاسی اثر وہاں نہ بڑھنے پائے۔ ہٹلر اور مسولینی میں باہم جو سمجھوتا ہوا تھا اس سے اٹلی کو (سوائے قبضۂ البانیہ کے) اور کوئی خاص فایدہ اسوقت تک نہیں پہونچا اور اب روس کے ساتھ جرمن تعلقات نے اس کو اور زیادہ مشتبہ کر دیا ہے۔ وہ اس سے بھی ڈرتا ہے کہ روس کی مداخلت یہاں اشتراکی تحریک پیدا کر دیگی جسے وہ اقتصادی و سیاسی دونوں حیثیتوں سے اپنے لئے نقصان رساں سمجھتا ہے

فرانس و برطانیہ کے تعلقات، بلقان میں زیادہ تر سرمایہ دارانہ رہے ہیں۔ انھوں نے زیادہ کوشش اس بات کی کی کہ یہ ریاستیں صنعتی ترقی زیادہ کریں اور جرمنی کو صرف خام پیداوار بھیجنے کا ذریعہ نہ بنی رہیں، لیکن اس میں بہت کم کامیابی ہوئی۔ کیونکہ جرمنی یہاں کی خام پیداوار کے عوض اپنے مصنوعات فراہم کیا کرتا ہے اور اسے یہاں بہت اچھا سودا مجھا جاتا ہے، علاوہ اس کے یہاں کی خام پیداوار کی کھپت نہایت آسانی سے جرمنی میں ہو جاتی ہے اور دوسرے دور دراز ملکوں کو بھیجنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی

جرمنی نے بلقان میں اپنا اقتدار قایم کرنے کے لئے بعض سیاسی حربوں سے بھی کام لیا ہے، مثلاً اس نے یہ بھی کیا کہ ان ریاستوں میں جہاں کہیں جرمن آبادی یا جرمن نسل سے تعلق رکھنے والی آبادی پائی جاتی تھی اس کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے مطالبات حکومت سے تسلیم کرائے اور اپنے جداگانہ حقوق حکومت سے حاصل کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نازیت کے جراثیم آہستہ آہستہ ہر جگہ پھیل گئے اور جرمن رائش کا خوف لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا، چنانچہ اسوقت ۳۵ لاکھ جرمن آبادی، ہنگری، یوگوسلیویا، رومانیا اور سوویٹ یونین میں پھیلی ہوئی بتائی جاتی ہے

اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اور قوموں کو بھی اپنے افراد کے حقوق کا احساس پیدا ہو گیا، یعنی ہنگری بھی کہنے لگا کہ رومانیا اور یوگوسلیویا میں ۲۵ لاکھ ہنگیرین پھیلے ہوئے ہیں، بلغاریا بھی رومانیا میں اپنی بارہ لاکھ کی آبادی کا ذکر کرنے لگا، روس بھی سربیا میں اپنی دو لاکھ آبادی کی حمایت پر آمادہ ہو گیا اور اس طرح بلقان کی تمام ریاستوں میں انقلاب و اختلاف کے جذبات پیدا ہو گئے چنانچہ ہنگری اور بلغاریا دونوں چاہتے ہیں کہ ان کا جتنا علاقہ رومانیا اور یوگوسلیویا نے لیا ہے وہ انھیں واپس ملجائے اور اگر بلقان پر جرمنی یا روس نے حملہ کیا تو ہنگری اور بلغاریہ کو بھی لالچ دلا کر وہ اپنے ساتھ ملا لیں گے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ فتح پولینڈ کے بعد ہی بلغاریا نے روس سے معاہدہ تجارت کی گفتگو شروع کر دی۔

یونان کی حالت البتہ ذرا مختلف ہے، کیونکہ اسے جرمنی کا اتنا خوف نہیں ہے جتنا اٹلی کا ہے ہر چند دونوں میں ایک نوع کا معاہدۂ اتحاد ہو چکا ہے لیکن یونان مطمئن نہیں ہے اور اسی لئے برطانیہ کا دامن نہیں چھوڑتا کہ اگر کسی وقت اٹلی نے حملہ کیا تو برطانیہ ہی اسے بچا سکتا ہے

ترکی، جسے اسوقت ریاستہائے بلقان کے لیڈر کی حیثیت حاصل ہے، بیشک فرانس و برطانیہ سے معاہدہ کر چکا ہے، لیکن اس معاہدہ کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ وہ روس و جرمنی سے جنگ کرنے پر بھی مجبور ہو۔ اگر روس نے بلقان پر حملہ کیا تو اتحادیئن کے جہاز مجبور ہوں گے کہ وہ درۂ دانیال سے گزر کر اپنی فوجیں بلقان میں اُتاریں اور یہ وقت میرے خیال میں ترکی کے لئے بہت نازک ہوگا اور نہیں کہا جا سکتا کہ حالات اسے کیا پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کریں گے

یہ ہیں وہ سیاسی پیچیدگیاں جن سے بلقانی ریاستیں اسوقت دوچار ہیں اور ان کا جو نتیجہ بھی ہو، لیکن تین باتیں بظاہر بہت کھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ فرانس و برطانیہ کا اثر وہاں وہ نہیں رہا جو اس سے قبل پایا جاتا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہی کہ بلقانی آبادی کی حفاظت کی ذمہ داری جو برطانیہ کی طرف سے لی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی اور ہٹلر نے جو دست درازیاں آسٹریا زیکوسلوویکیا اور پولینڈ پر کی ہیں ان کو دیکھ کر بلقانی ریاستیں بھی ڈر رہی ہیں کہ اتحادیئن جب تک مدد دینے کا فیصلہ کریں اسوقت تک کہیں وہ ختم نہ ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ روس کی مداخلت نے جرمنی کے اثرات کو جو یہاں پائے جاتے تھے بہت کم کر دیا ہے اور اٹلی ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر چکا کہ اسے کیا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ روس کے ساتھ ملکر وہ کام نہیں کر سکتا اور جرمنی سے بھی وہ اس لئے خفا ہے کہ اس نے روس کو کیوں بلقان میں مداخلت کا موقعہ دیا۔ تیسری بات یہ ہے کہ بلقانی ریاستیں اب پوری طرح محسوس کر رہی ہیں کہ دول عظمیٰ میں سے کوئی ان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا، جب تک وہ خود آپس میں اتحاد پیدا کر کے روس و جرمن کے خلاف ایک متحدہ محاذ قایم نہ کریں ـــ بہرحال دریائے ڈینوب کی وادیوں پر اسوقت جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس وقت برس پڑیں۔

تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کو پٹرول کی سخت ضرورت ہے اور وہ رومانیا کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اُسے پٹرول فراہم کرے۔ ظاہر ہے کہ رومانیا پر حملہ کرنے کے لئے یہی اک بہانہ کافی ہے۔ اگر جرمنی نے حملہ شروع کر دیا تو روسی فوجیں یقیناً رومانیا کے مشرقی علاقہ (سربیا) کی طرف بڑھیں گی لیکن پولینڈ کی طرح یہاں کامیابی آسان نہیں ہے، کیونکہ بلغاریہ، ہنگری اور ترکی اس کو کبھی گوارا نہ کریں گے اور پھر اٹلی اور یونان کو بھی اس آگ میں کودنا پڑے گا

رہا یہ سوال کہ اتحادیئن اس صورت میں کیا کریں گے، اس کا بڑا انحصار اس امر پر ہے کہ مغربی محاذ کا اُسوقت کیا رنگ رہتا ہے۔

عہدِ قدیم کا اِنسان کیا نہ جانتا تھا

آج دنیا کی علمی ترقیاں اور اُصولِ اخلاق کی بلندیاں بہت حیرت انگیز نظر آتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس آسمان کے نیچے دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے اور عہدِ حاضر کے اکثر اختراعات و ایجادات کا سراغ تاریخ انسانی کے عہدِ ماضی تک پہونچتا ہے۔ آپ کو شاید یہ سنکر تعجب ہوگا کہ بڑے بڑے پہیوں اور دباؤ ڈالنے والے انجنوں کا اسٹیم کے ذریعہ سے حرکت میں لانا، عہدِ قدیم کے انسان کو بھی معلوم تھا اور طباعت و جلد سازی سے بھی وہ بخوبی واقف تھا۔

ولادتِ مسیح سے صدیوں پہلے، رُوم کے برتن بنانے والے روز کے استعمالی ظروف پر ٹائپ کے ذریعہ سے اپنے نام نقش کر دیتے تھے، اور نویں صدی عیسوی میں اہلِ چین، بلاک بنا بنا کر کتابیں چھاپا کرتے تھے۔

قدیم اسکندریہ میں، اشتہاروں کے لئے ستون نصب کئے گئے تھے اور انھیں پر اعلانات وغیرہ گوندسے چسپاں کئے جاتے تھے۔ روم میں بڑے بڑے تختوں کا بھی رواج تھا جن پر سیاہ و سرخ حروف میں اشتہارات تحریر کئے جاتے تھے۔

اُر کے کھنڈروں سے جو چیزیں دستیاب ہوئی ہیں، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سے ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق کی سُمیری آبادی ڈامر اور اسبتوس[1] (Asbestos) کا استعمال جانتے تھے۔ اسی طرح کنکریٹ اور سیمنٹ کی عمارتیں بنانا بھی انھیں معلوم تھا۔

آگ بجھانے کا انجن مسیح سے ۲۰۰ سال قبل ہی یونان میں ایجاد ہو چکا تھا اور روم میں تو باقاعدہ آگ بجھانے والا بریگیڈ بھی تھا۔ قدیم دُنیا میں خود حرکت کرنے والی (Automobile) مشینیں بھی پائی جاتی تھیں، چنانچہ اسکندریہ کے معبد میں ایک ایسی مشین رکھی ہوئی تھی جس کے اندر سکّہ ڈالنے سے مقدس پانی کی ایک مقدار از خود مل جاتی تھی۔ فراعنہ سے پہلے بطلیموسی خاندان کے زمانہ میں ایک مشین کا بنا ہوا آدمی طیار کیا گیا تھا۔ روم میں نہ ٹوٹنے والا شیشہ بھی لوگوں نے بنا لیا تھا جو ہتوڑوں کی ضرب سے بھی نہ ٹوٹ سکتا تھا، لیکن وہ طریقہ آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔

---

[1] ایک ریشہ دار معدنی چیز جو آگ کو قبول نہیں کرتی جیسے ابرک۔

سَن کا کپڑا طیار کرنا مصرِ قدیم کے نہایت ابتدائی عہد کے لوگوں کو معلوم تھا جس کا ثبوت مومیائی شدہ لاشوں کے لباس سے ملتا ہے۔ توریت میں جن لباسوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن سے پتہ چلتا ہے کہ معبدوں کے پردے اور راہبوں کے لباس نہایت نفیس کپڑے کے ہوتے تھے۔ تین ہزار سال قبل کی مومیائی شدہ لاشوں کے کپڑوں میں اب بھی وہی نرمی پائی جاتی ہے اور اُن کا رنگ تو ایسا نظر آتا ہے گویا ابھی نیا تھان سامنے کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔

افلاطون نے، پانی سے چلنے والی گھڑی میں ایک ٹیڑھی نلی لگا کر اس کو الارم کلاک بنا لیا تھا۔ جس وقت پانی اس نلی کی سطح تک پہونچتا تھا تو وہ دوسرے ٹیوب سے اتنی تیزی کے ساتھ گزرتا تھا کہ اس سے سیٹی کی آواز پیدا ہوتی تھی افلاطون نے یہ ایجاد اس لئے کی تھی کہ اس کے شاگردوں کو صبح چار بجے اس کا علم ہو جائے اور وہ اُٹھ بیٹھیں۔ ایک پانی سے چلنے والی گھڑی کا ہشت پہل مینار جو آخری صدی قبل مسیح میں طیار کیا گیا تھا، اب بھی پایۂ تخت یونان میں قایم ہے۔

خارجی گرمی پہونچا کر انڈوں سے بچے نکالنے کا طریقہ قدیم مصریوں کو بھی معلوم تھا چنانچہ ان مشینوں سے بیک وقت سات سات ہزار انڈوں سے بچے نکالے جاتے تھے۔ ان مشینوں میں اُپلے یا بھوسے کی آگ سے گرمی پہونچائی جاتی تھی۔ وٹروویس (Vitruvius) نے جو پہلی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا، اس زمانہ کے آلاتِ مکبر الصوت (Loud Speaker) کا ذکر کیا ہے جن کو Echea (یعنے آواز بازگشت کو قوی کرنے والا) کہتے تھے۔ یہ کانسے کے ظروف تھے جو تھیٹر کی دیواروں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں نصب کر دئے جاتے تھے، آواز ان سے ٹکرا کر بہت بلند ہو جاتی تھی اور بہت سریلی ہو کر سامعین کے کانوں تک پہونچتی تھی۔ اسی طرح کے آواز بڑھانے والے آلات اسٹیج کی طرف بھی ستونوں سے نصب کر دئے جاتے تھے تاکہ آواز کا تموج بڑھ جائے۔ یہ مختلف سایز کے ہوتے تھے اور اس طرح سُر میں ایک دوسرے سے گھٹا بڑھا کر ملائے جاتے تھے کہ اُن سے بالکل انسانی آواز پیدا ہو۔

فولاد کے نہایت عمدہ پھل بنانا بھی انھیں معلوم تھا، جس کا ثبوت تلواروں اور خنجروں کے پھل سے ملتا ہے۔ ان پر وہ کچھ نشانات بھی بنا دیتے تھے جو مٹتے نہ تھے۔ فولاد کو اس قدر سخت بنا دینے کا راز ابتک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا قدیم اہلِ ہند کے لوگوں کو معلوم تھا کہ زنگ نہ لانے والا لوہا کیونکر طیار کیا جاتا ہے، چنانچہ دہلی میں ساڑھے تین سو سال قبل مسیح جو لوہے کی لاٹ نصب کی گئی تھی وہ آج تک موجود ہے اور اس پر زنگ کا نام نہیں۔ یہ فن بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ ہاتھی دانت کو اُبال کر نرم کرنا اور اس سے مجسمے طیار کرنا یہ فن بھی عہدِ قدیم کے انسان کو معلوم تھا جو ابتک ہمیں معلوم نہیں ہوا۔

قدیم روما میں مکانوں کو گرم رکھنے کے لئے یہ ترکیب کی جاتی تھی کہ گرم ہوا فرش مکان کے نیچے اور دیواروں کے اندر دوڑا دی جاتی تھی۔ چونکہ فرش اور دیواریں پتھر کی ہوتی تھیں اس لئے سردی میں ان کی ٹھنڈک بہت بڑھ جاتی تھی

اور اس کو دور کرنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی جاتی تھی۔

معبدوں میں عجیب و غریب میکانکی ترکیبوں سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً قربانگاہ کی آگ سے یہ کام بھی لیا جاتا تھا کہ ہوا کو پھیلا کر نلوں کے اندر سے لیجاتے تھے اور مصنوعی چڑیوں کے اندر سے یہ ہوا گزر کر مختلف آوازیں پیدا کرتی تھی۔ سنگین بتوں میں حرکت بھی میکانکی طریقوں سے پیدا کی جاتی تھی۔ چنانچہ اسکندریہ کے معبد سرالیس کے گنبد میں ایک مقناطیس اس طرح رکھ دیا گیا تھا کہ بت کے سر کو وہ کھینچتا تھا اور وہ بت اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ بہت سے معبدوں میں قربانگاہوں کے پتھر کے نیچے، ہوا کا خزانہ بنا رہتا تھا جس کا تعلق زیر زمین نلوں کے ذریعہ سے ایک ایسے ظرف سے تھا جو پانی سے لبریز رہتا تھا۔ جب گرمی سے اس کا پانی جوش کھاتا تھا تو ایک دوسرے ظرف میں چلا جاتا تھا جو اس کے پاس ہی معلق رہتا تھا اور جب اس کا وزن بڑھ جاتا تھا تو پوشیدہ پہیوں کے ذریعہ سے مندر کا دروازہ کھول دیا کرتا تھا اور کوئی آواز پیدا نہ ہوتی تھی۔

مصر کے پوجاری علم مناظر و مرایا (Optics) سے بخوبی واقف تھے۔ جب کوئی شخص پوجا کرتا تھا تو مندر کی پشت کی دیوار پر دفعتاً بت کا چہرہ نمودار ہو جاتا تھا، اس کی ترکیب یہ تھی کہ بت کے سامنے ایک مقعر (Concave) آئینہ ہوتا تھا جس کے ذریعہ سے سامنے کی دیوار پر بت کا عکس پڑتا تھا۔

اَپالو کے بت کا جلوس جس وقت باہر نکالا جاتا تھا تو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے تخت سے اٹھتا تھا اور پھر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ بت کھوکھلی لکڑی کا ہوتا تھا اور اس کے اندر گیس سے بھرا ہوا غبارہ رکھدیا جاتا تھا جو اسے ابھارتا رہتا تھا۔

صنعت و حرفت میں فیکٹری سسٹم اسوقت کی چیز بتائی جاتی ہے لیکن سنٹ آگسٹاین ہیو کا بشپ لکھتا ہے کہ عہد قدیم میں بھی یہ طریقہ رائج تھا اور ایک ہی چیز مختلف کاریگروں کے ہاتھ سے نکل کر تیار ہوتی تھی۔

پریسیڈنٹ روزولٹ صدر امریکہ کی یہ اقتصادی تدبیر کہ غلہ کے ذخیرے محفوظ رکھنا چاہئے تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں، پیغمبر یوسف کو بھی معلوم تھی، جنھوں نے مصر میں اس پر عمل کیا تھا۔ قدیم مصر میں غلہ کے مستقل کھتے رکھے جاتے تھے اور آجکل کی طرح غلہ کا تبادلہ غلہ سے، تقاوی، فصلوں کا بیمہ اور بھاؤ کی نگرانی سب وہاں پائی جاتی تھی

اشیاء خوردنی کو محفوظ رکھنے کی ترکیب بھی انھیں معلوم تھی، چنانچہ اسوقت کی محفوظ کی ہوئی مچھلیاں اب تک اچھی حالت میں دریافت ہوئی ہیں۔ ان کو کپڑے میں لپیٹ کر صحرا کے آیوڈین (Iodine) ملے ہوئے پانی میں رکھدیتے تھے۔

ہیرو ڈوٹس، جو چوتھی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا، لکھتا ہے کہ امراء مصر اپنے ہاتھ میں (ایک قسم کا پتھر) Quartz کی چھوٹے چھوٹے گیند رکھا کرتے تھے تاکہ ہاتھ ٹھنڈے رہیں۔

برف بنانا یا برف سے چیزوں کو ٹھنڈا رکھنا بھی پچھلے لوگوں کو معلوم تھا۔ گڑھوں میں مٹی کے پیالے رکھکر برف جمانا قدیم اہلِ ہند کو معلوم تھا اور اسکندر اعظم کے زمانہ میں آسمانی برف کو دبا دبا کر گڑھوں میں بھر دیتے تھے اور عرصہ تک اس سے کام لیتے تھے۔ نیرو پہلا بادشاہ تھا جس نے شراب کو برف میں لگا کر ٹھنڈا کرنا رائج کیا۔ سنیکا اور پلوٹارک اب سے بہت پہلے نباتاتی اُصول کے عادی تھے اور رامسیس ثانی (فرعون مصر) نے ۱۲۵۰ قبل مسیح میں ایک مانع شراب نوشی لیگ قایم کی تھی۔

علاج کی غرض سے بجلی کا استعمال بھی عہد قدیم میں رائج تھا، چنانچہ دردِ سر میں ایک ایسی مچھلی کا استعمال ہوتا تھا جس کی برقی رو اعصاب میں سکون پیدا کر دیتی تھی۔ عمل جراحی کے لئے مردم گیاہ (Man Drake) بوٹی کھلا کر ایک انسان کو تین چار گھنٹے تک کے لئے بیہوش و بے حس بنا دیا جاتا تھا۔ مٹی کی تختیاں جو سواحلِ دجلہ سے دریافت ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۰۰ ق۔م، اسیریا کے ایک بادشاہ کا علاج مُنتھی سے کیا گیا تھا بابل کے کھنڈروں سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کی جو گلی تختیاں دستیاب ہوئی ہیں ان میں بخار کی مکھی کا ذکر پایا جاتا ہے جس سے مراد مچھر ہے۔ گویا یہ حقیقت انسانِ قدیم کی دریافت کی ہوئی ہے کہ مچھر سے فصلی بخار پھیلتا ہے۔

قدیم مصر میں آبپاشی کی نہروں کو گھاس وغیرہ سے صاف رکھنے کے لئے لقلق (ایک چڑیا بگلا یا سارس کے قسم کی) پالے جاتے تھے اور یونان میں طاعون کے چوہے فنا کرنے کی خدمت سانپوں کے سپرد تھی۔ بعض امراض کے ٹیکہ کا رواج قدیم ہندوستان اور چین میں پایا جاتا تھا۔

بدن کی مالش کے ذریعہ سے علاج ۴۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا اور یونان کا ایک حکیم ۵۰ سال قبل مسیح میں علاوہ مالش کے سرد پانی، مینہ کے پانی اور ننگے پاؤں ریت پر چلانے سے بھی کیا کرتا تھا اور شاہ آگسٹس کا علاج ایک طبیب موسیٰ نامے نے اسی طریقہ سے کیا تھا۔

زخمیوں کے لئے مصنوعی اعضا بھی طیار کئے جاتے تھے، چنانچہ ۲۱۸ قبل مسیح میں کیٹی لائن (Catetine) کے پردادا کے لئے جنگ قرطاجنہ میں ایک مصنوعی ہاتھ تیار کیا گیا تھا۔ انگلستان کے رایل کالج آف سرجنس میں ایک مصنوعی پاؤں ۳۰۰ سال قبل مسیح کا بنا ہوا رکھا ہے۔ قدیم ہند کے باشندے پلاسٹر سے مصنوعی ناک، ہونٹ اور کان بناتے تھے۔

رومہ و یونان کی قدیم تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غدودوں کا علاج کوئی نئی چیز نہیں ہے، اور مریضوں کو جوش دیا ہوا پانی پلانا بھی انھیں معلوم تھا۔ ہیرو ڈوٹس لکھتا ہے کہ (Cyrus) شاہِ فارس اپنے ساتھ ہمیشہ جوش دیا ہوا پانی چاندی کے برتنوں میں رکھا کرتا تھا، اسی طرح رومہ کا مشہور بادشاہ نیرو بھی ہمیشہ اُبلا ہوا پانی پیتا تھا۔

پمپیائی میں بعض قدیم آلات ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے بعض امراض کا علاج آپریشن سے کیا جاتا تھا۔ یہ آلات لوہے کے ہیں، لیکن اس قدر تیز و صاف ہیں کہ آج بھی ان سے آپریشن کیا جا سکتا ہے۔ جولیس قیصر اپنی ماں کے پیٹ سے آپریشن کے بعد ہی پیدا ہوا تھا اور اسی لئے یہ آپریشن اب بھی اسی کے نام سے منسوب ہے اور اُسے (Caesarian Section) کہتے ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے بعض کاسہائے سر ایسے ملے ہیں جن پر جراحی کے نمایاں نشانات موجود ہیں۔

سکندر اعظم کے زمانہ میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا (اگرچہ ارسطو اسے پسند نہ کرتا تھا) مصرِ قدیم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ہزار سال قبل مسیح، موتیا بند کے آپریشن کا وہاں رواج عام تھا۔ بعض مومیائی شدہ لاشیں ایسی بھی ملی ہیں، جن کے دانت مصنوعی ہیں اور بعض کی آنکھیں بھی۔

بال اُگانے کے لئے رینڈی کا تیل دوسرے کسی تیل میں ملا کر اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں ڈاکٹر جانتے تھے کہ انسانی جلد پر سورج کی مصنوعی روشنی، بلور کے شیشے کے ذریعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے اور محدب شیشوں کے ذریعہ سے بدن جل سکتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ڈاکٹروں کو فیس بھی دی جاتی تھی، چنانچہ پلینی (Pliny) لکھتا ہے کہ شاہی طبیبوں کو علاوہ اُس فیس کے جو عام لوگوں سے ملتی تھی سالانہ ۵۰، ۲ پونڈ ملا کرتے تھے اور روم کے مشہور طبیب (Galen) کی فیس ۵۰ پونڈ تھی۔

روحوں کو بلانا اور میز کا گردش میں لانا قدیم مصر میں بھی رائج تھا، مصر ہی سے یہ رسم یونان میں پہونچی اور پھر تمام عیسوی دنیا میں عام ہو گئی۔

حضرت موسیٰ سے بہت پہلے قوتِ مقناطیس سے کام لیکر خود اپنے آپ کو بیہوش کر لیتے تھے اور بعض بیماریوں کا علاج اسی عالمِ بیہوشی میں بتاتے تھے۔ سنٹ آگسٹاین کا بیان ہے کہ ایک پادری اپنے آپ کو ایسا بیہوش و بے حس بنا لیتا تھا کہ اس پر زخموں کا بھی اثر نہ ہوتا تھا اور اسی عالم میں، وہ غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا۔

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا۔ (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر نگار

کلامِ ماہر لکھنوی

"طاقِ نسیاں" کی جستجو اکثر ایسے جواہر پاروں سے روشناس کرتی ہے جو "گردِ تغافل" کے تہ بتہ طبقوں میں پوشیدہ ہو گئے ہیں مگر دستِ طلب کی معمولی سی تحریک جب انھیں نمایاں کر دیتی ہے تو آنکھوں میں چکاچوند ہونے لگتی ہے۔

نواب مولوی میر مہدی حسین ماہر مرحوم انہی "جفا کشیدۂ روزگار" افراد میں سے ہیں جنھیں دُنیا نے اُن کے بعد بھلایا اور ایسا کہ جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

آج یہ اُن کی نہیں، ادب کی خوش قسمتی ہوگی کہ اُن کے کلام سے اربابِ ذوق کا تعارف ہو جائے اور معلوم ہو کہ خاکِ غفلت میں کیا صورتیں ہیں جو اب تک پنہاں ہیں۔

ماہر لکھنؤ کے مشہور "خاندانِ اجتہاد" کے ایک ممتاز فرد تھے، اس لئے اُن کے نام کے ساتھ مولوی لکھا جاتا ہے اور قدرت نے دنیاوی جاہ و جلال، مال و دولت عطا کیا تھا اس لئے نواب کہے جانے لگے۔

ابتدائی عمر میں عربی صرف و نحو اور ادبیات کی تحصیل کی اور معلوم نہیں کہاں تک پڑھا۔ تاج العلماء مولانا سید علی محمد (متوفی سنہ ۱۳۱۲ھ) سے مختصر معانی پڑھنے تک کا پتہ کتابوں سے چلتا ہے اس کے بعد شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور منشی مظفر علی خاں اسیر کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور برابر اُنہی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اس طرح ماہر کا ادبی سلسلہ صرف ایک واسطہ سے مشہور اُستادِ سخن مصحفی تک پہونچ جاتا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ جب لکھنؤ کی شاعری میں رندانہ بے باکیوں کا دور دورہ تھا اور ابتذال کی فراوانی تھی۔ خود منشی اسیر کے ممتاز شاگرد امیر مینائی ایسے "مقدس" اور "مذہبی" انسان کا کلام "اچکوں" وغیرہ کی ایسی رکیک لفظوں سے خالی نہ رہا۔ مگر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ ماہر کا کلام اس طرح کے ابتذال سے بالکل پاک ہے۔

لکھنؤ کی شاعری کے خصوصیات انگیا چوٹی، کاجل، مسّی وغیرہ کا اُن کے یہاں پتہ بھی نہیں، اُنھوں نے اپنے لئے ایک دنیا ہی الگ بنائی تھی جہاں تمام کائناتِ عالم اُن کے سامنے تھی اور ہر ایک سے تشبیہات کے ذریعہ وہ بوقلموں نصائح و مواعظ اور مضامین کا خزانہ فراہم کرتے تھے۔

یہ وہ انفرادی رنگ ہے جس میں ماہر اپنی آپ مثال نظر آتے ہیں۔ اس کے اوپر سیر حاصل بحث بعد کو آئے گی

جہاں آپ کو کائنات عالم شاعر کے پیش نگاہ دکھلائی دے رہی ہوگی - ابھی دوسرے خصوصیات کو سنئے جو عام طور سے شاعری کے محاسن میں سمجھے جاتے ہیں -

ماہر کے کلام میں یہ خصوصیات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں :-

صفائی و سادگی - لطف زبان - محاورات - شوکتِ الفاظ - فارسی ترکیبوں کا اعتدال - مشکل پسندی - طنز - محاکات - ندرت اسلوب - جذبات کی تحلیل - منظر کشی - حکیمانہ وعظ و نصیحت اور اخلاقی شاعری -

یہ وہ چیزیں ہیں جو شاعری کے اصل جوہر سے تعلق ہیں اور اس کے علاوہ تشبیہ - استعارہ - مراعات النظیر - طباق و تضاد ایہام تناسب وغیرہ وغیرہ جو شاعری کے خارجی زیور ہیں - انھوں نے ناسخ کے بعد اسے لکھنؤ کی شاعری میں اکثر مقصد اصلی کی حیثیت اختیار کرلی تھی مگر ماہر نے اُنھیں وہی ضمنی درجہ عطا کیا ہے جس کے یہ مستحق ہیں -

اب ہر ایک عنوان کے تحت میں کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

صفائی و سادگی

ماہر کے کلام میں ایسے اشعار کثرت سے ہیں جن میں تکلف و تصنع کا لگاؤ نہیں معلوم ہوتا ہے شعر کہا نہیں گیا بلکہ الفاظ نے مجتمع ہو کر خود شعر کی شکل اختیار کرلی ہے - ملاحظہ ہو :-

میں عزیزوں سے بھلا ترکِ وفا کیا کرتا
خون میں خون ملا تھا تو جدا کیا کرتا

آپ بیٹھا ہوا زخموں پہ چھڑکتا ہوں نمک
اور اب مجھ سے محبت کا مزا کیا کرتا

ہم نے تو جان نذر دی ، دل کو فدا کیا
اب تم بتاؤ چاہنے والوں سے کیا کیا

نہ پوچھو عشق نظر میں کہ کیا گزرتی ہے
تڑپ رہا ہوں کلیجہ پر تیر کھائے ہوئے

اُنہی سے پوچھئے صدمہ اسیروں کی جدائی کا
کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں جو آشیاں میرا

جنازہ لا کے لحد پہ پٹک دیا سب نے
میں بارِ دوش تھا، اک دفن بھی بہانہ ہوا

ہزاروں آپ کی ہوتیں ادائیں اُس میں بھی
بری بھی بات جو منھ سے نکل گئی ہوتی،

وہ دن خدا دکھائے کہ قاصد یہ دے خبر
لیجے وہ آپ آتے ہیں خط کے جواب میں،

مضمون پتے کے لکھ کے مجھے خوب بن پڑی
غصہ نکالنے وہ خود آئے جواب میں

جگر و دل کو تو کھوئے ہوئے گزری مدت
پھر نجانے کہ یہ سینہ میں تڑپتا کیا ہے

کچھ ایسا پڑ گیا ہے محبت میں تفرقہ
دل کی ہمیں تو دل کو ہماری خبر نہیں

خوشی یہی ہے تو اچھا سنو گلہ دل کا
کسی طرح سے سہی ہو تو فیصلہ دل کا

وہ دیکھ لیں تو نہ ہو دل نہ ولولہ دل کا
لڑے نگاہ تو ہو جائے فیصلہ دل کا

کسی کے آنے کا احسان اب نہیں مجھ پر
لحد پہ جو مری آیا پئے ثواب آیا

لاکھوں ہی حسرتیں ہیں تمنائیں سیکڑوں
بستی جو میرے دل میں بسی ہے کہیں نہیں

آئینہ لیکے جاؤں نہ کیونکر میں سامنے
اُن کی کسی طرح سے ادھر کو نظر تو ہو،

یہی نشانِ دلِ حزیں ہے
سمجھے جہاں ہاتھ دل وہیں ہے

ایک نے حق میں ہمارے نہ کہا کلمۂ خیر
سب کا مُنھ دیکھتے ہم مجمع محشر میں رہے

نجانے جنبش ابرو میں دل پہ کیا بنتی
ہنسی ہنسی ہی میں تلوار چل گئی ہوتی،

عدم سے آئے ہیں، جائیں گے پھر عدم اک دن
اس ابتدا کو ہم انجام کار سمجھے ہیں،

دل کو برباد کیا آرزوؤں کو بے گھر
تم سا عالم میں کوئی خانہ برانداز نہیں

باغ میں آکے اسیرانِ قفس کیا بہلیں
سب ہوائیں ہیں ہوائے پر پرواز نہیں

لطف زبان

ماہر کو بجا طور سے اپنی زباں دانی پر ناز تھا کیونکہ وہ لکھنؤ کے ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں بیرونی عناصر کا اثر بالکل نہیں پڑا تھا۔ پھر اُن کی صحبت بھی ارباب کمال اور سخنوروں کا مجمع تھی۔ مولانا علی میاں کامل۔ بنے صاحب مشاق وغیرہ کا ہر وقت کا اُٹھنا بیٹھنا تھا اس لئے ان کی زبان اور نکھر گئی۔

چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

نظمِ اشعار میں بھی حسن بیاں ہے ماہر
جس کو کہتے ہیں زباں، ہم وہ زباں رکھتے ہیں

ذیل کے شعروں میں زبان کا لطف خاص طور پر نمایاں ہے:۔

تنگ ہوں زیست سے، اے موت مسیحائی کر
جان آجائے اگر روح بدن سے نکلے

تھا قیام اپنا بہارِ چمنستاں کی طرح
وہ وطن ہی نہ رہا ہم جو وطن سے نکلے

دیکھو خرام ناز سے دبتا ہے دل مرا
پھر یہ کہوگے ہمسا کوئی نازنیں نہیں

رسوائے خلق بھی ہوئے، منھ پر بھی آئی بات
وصلت میں اور کیجئے مجھ سے نہیں نہیں

توبہ! یہیں کہیں چھپے بیٹھے ہو میری جاں
یہ بھی کہیں ہوا ہے کہ ہو اور کہیں نہیں

دل مرا اب نگہ تند کو بر آنے دو
تیر خالی جو گیا، دور کرو، جانے دو

جائے کس طرح طنطنہ اُن کا،
ابھی اُٹھتی ہوئی جوانی ہے

سنتے ہو اے کلیم اُن کی صدا؟
جن کو دعوائے لن ترانی ہے

دل و جگر کی تمنائیں قتل ہوتی ہیں
اُجڑ رہے ہیں مرے گھر بسے بسائے ہوئے

نہ دل میں حسرتیں اب ہیں، نہ دل ہی سینہ میں
بتوں کی راہ میں بیٹھے ہیں گھر لٹائے ہوئے

مجھ کو پھر درد کی باتوں کا مزا مل جائے
منھ میں دم بھر کو زباں بن کے اگر دل ٹھیرے

خطا مجھی سے ہوئی، اب جو کچھ کہوں مجرم
چلو، سدھارو، مبارک تمھیں گلہ دل کا،

تم ہنسو پھولوں سے بلبل کو میں بڑھ کر چھیڑوں
باغ میں آکے کوئی نگ تو کھلائیں ہم تم

رنج میں رنج ہی شاید سببِ تسکیں ہو
آؤ روتے ہوئے دل کو تو رُلائیں ہم تم

دیکھو پھولی ہے شفق، وقت ہے سرخ ہے یہ
آگ میں آگ چلو اور لگائیں ہم تم

مجمع ہے اک خدائی کا ماہر کے دفن میں
تم بھی چلو شریک ہو کارِ ثواب میں

دنیا اِدھر کی جن سے ہوا کرتی تھی اُدھر
وہ کروٹیں فقط ترا بیمار لے گیا

ڈھونڈھیں تڑپ تڑپ کے مریض جہاں ہزار
جو درد تھا وہ آپ کا بیمار لے گیا

شکستِ رنگ سے گل دیتے ہیں یہ صدا صدا
خزاں نصیب چمن، ہم بہار لیکے چلے

وہ عندلیب تھے ہم جن کے دم سے لطفِ چمن
چلے جو اڑ کے تو رنگِ بہار لیکے چلے

جہاں میں آئے تھے ماہر تو تھی سبکدوشی
چلے تو سر پہ گناہوں کا بار لیکے چلے

محاورات

یہ حقیقتاً زباں دانی کا اہم شعبہ ہے۔ جتنا شاعر کو زبان پر اقتدار ہوگا اُتنا ہی محاورات اُس کے یہاں زیادہ لطف سے نظم ہوں گے چنانچہ ماہر کے یہاں یہ ذخیرہ بہت فراواں ہے۔ ملاحظہ ہو:-

گھر اُن کے جاکے سنا یہ عوض میں خاطر کے
سرا تھی کیا جو چلے آئے منھ اُٹھائے ہوئے

بتا یہ کوچۂ دلدار کا ہے اے قاصد
ہزاروں بیٹھے ہیں واں دھونیاں رمائے ہوئے

نصیب آنتوں میں کھلتے ہیں دیکھیے کس کے
بڑھے ہیں قتل کو وہ آستیں چڑھائے ہوئے

تقاضا سن کا ہے الڑھ پنے سے راہ چلو
ادا یہ کہتی ہے چال اور بھی بنائے ہوئے

منعمو عالمِ فانی میں خوشی ہے معدوم
کان بجتے ہیں کہ نوبت کی صدا آتی ہے

سچ تو کہتے ہیں کہ سولی پہ بھی نیند آتی ہے
شمع پر سو گئے پروانے تو کچھ دل ٹھہرے

کرتے ہیں ہم کو ذبح جو وہ آستیں چڑھائے
لوگوں کا ٹھٹھ لگا ہے تماشائے عام ہے،

رازِ دل کہتے ہو بیمار سے کچھ خیر تو ہے
نہ سہی غیر کوئی، حال مرا غیر تو ہے،

بھرا ہوا تھا نجانے یہ کب کا اے گردوں
برس پڑا مری تربت پہ جب سحاب آیا،

کہے نہ دل کی تو کیونکر نہ ہو گلہ دل کا
کبھی تو منھ سے بھی پھوٹے کچھ آبلہ دل کا

منہدی پاؤں کی نہ چھٹ جائے گی چلیے دو گام
آپ بھی پاس ہیں تربت بھی مری دور نہیں

شوکت الفاظ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شوکتِ الفاظ فارسی ترکیبوں ہی سے پیدا ہوتی ہے، یہ خیال کلیتہً صحیح نہیں ہے۔ خالص اردو الفاظ کے اجتماعی تیور بھی شوکت کا باعث ہو سکتے ہیں،

بہر حال یہ امر ایک حد تک قابل تسلیم ہے کہ غزل میں شوکتِ الفاظ کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ یہ چیز قصیدہ کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ناسخ نے غزل میں اس خصوصیت کا بہت استعمال کیا جس کی وجہ سے اُن کی غزل کے شعر اکثر قصیدوں میں کھپائے جانے کے قابل ہیں۔ غزل میں شوکتِ الفاظ کسی کسی موقع پر اس حد تک ممدوح ہے کہ شعر میں ایک تیکھاپن پیدا ہوجائے۔ اس کے لئے محل کی شناخت شاعر کی سلاست طبع اور صحت ذوق پر مبنی ہے۔

ماہر نے غزل میں اس جنس کا استعمال کمی کے ساتھ کیا ہے۔ پھر بھی بعض اشعار میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

لگا اتنی تو آگ اے آتشِ فرقت سراپا کو
سپند آسا اُڑا دوں مجمرِ دل سے سویدا کو

آفریں اے زورِ بازو، مرحبا اے جذبِ عشق
لے اُڑا کنجِ قفس زورِ پرِ پرواز سے

تن خاک ہے تو زیست کا کیا اعتبار ہے
جو عضو ہے غبار کا نقش و نگار ہے

کہتا ہے اُٹھ کے زور میں یہ دردِ دل مرا
یا میں رہوں زمین پہ یا آسماں رہے

او دلِ جانباز رہیو باادب شمشیر پہ
یہ وہ جادہ ہے جہاں سر بھی قدم بن جائے گا

آپ دیکھتے ہیں کہ ان اشعار میں ایک خاص قوت مضمر ہے اور وہ ایک ایسے ہی محل پر ہے جہاں کمزورِ اندازِ معانی کی نوعیت کو برقرار ہی نہیں رکھ سکتا۔

فارسی ترکیبوں کا اعتدال

ہندوستانی مسلمانوں کے اندر گزشتہ صدی کے آخر تک فارسی زبان کا اتنا رواج تھا کہ عام طور سے خط و کتابت فارسی ہی میں ہوتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے اُردو کلام میں فارسی ترکیبوں کا کثرت سے استعمال ہوا، اس سے کوئی شاعر مستثنیٰ نہیں ہے۔

میر تقی میر ایسا اُستاد جس کے یہاں صفائی و سادگی شاعرانہ اعجاز کے درجہ پر پہونچ گئی ہے وہ بھی اس طرح کے اشعار ضرور کہہ گزرتا ہے:۔

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا،

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا،

صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

پھر کسی اور کا کیا ذکر، غالب نے اپنے فطری ذوق فارسی کے غلبہ سے اس میں کچھ اضافہ کر دیا اور ایسے اشعار بھی کہہ دئے جن میں اگر روابط اُردو کے نہوں تو معلوم ہی نہو کہ یہ شعر فارسی کا ہے یا اُردو کا۔ بہر حال اس سلسلہ میں عدم اعتدال اس حد تک کہ اُردو زبان جس کی متحمل نہ ہو کسی طرح ممدوح نہیں۔ ماہر نے فارسی ترکیبوں کا جہاں تک استعمال کیا ہے

اُس میں اعتدال کا پہلو ملحوظ رکھا ہے۔ اُن کی فارسی ترکیبیں طبیعت پر بار اور زباں پر گراں نہیں ہیں۔

ہمراہ بوئے غنچہ کرو تم بھی سیرِ باغ — سب قفل کھل گئے ہیں طلسمِ بہار کے
ملالِ رنجشِ ہر آشنائے یار رہا — صفائی بن کے مرے قلب میں غبار رہا
مثالِ دانۂ بارودِ روئے آتش ہوں، — نہ ہوش اڑیں جو چمک درد کی اٹھا نہ سکے
برقِ آہِ غمِ سوزاں جو نکل کر چمکی، — دودِ دل بھی صفتِ ابرِ بہاراں نکلا
سبب ہے کیف فلک کا مری عرق ریزی — یہی شراب تھی مینائے آسماں کے لئے
بھرا خون قاتل کے دامن میں جب — بہارِ ریاضِ ادا ہو گیا،
کیا محو طی ارض کوئی رہگزر میں ہے — پیچیدگی غبارِ طریق سفر میں ہے
ہمتِ مردانگی غم کے شکنجوں میں خموش — جنتری میں تار جب کھنچتا تھا بے آواز تھا
گر نہ کیجئے قدر تو ناقدر دانی آپ کی — ہر ادا ہے ناز پروردِ جوانی آپ کی

مشکل پسندی یہ ایک خاص طرزِ کلام ہے جس کے ساتھ معنی ذرا غور کرنے کے بعد واضح ہوں۔ موجودہ زمانہ کے بہت سے تعلیمیافتہ اور روشن خیال لوگ اس جنس شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں:-

پاؤں اُلجھے رہے دامن سے طریقِ غم میں — ہاتھ طے کر کے رہ چاکِ گریباں نکلا
ضعف جب ساری مرا ہنگام جرم ساز تھا — چنگ کا نالہ شکستِ رنگ کی آواز تھا
ضعف میں جب طائرِ تصویر سے کچھ ساز تھا، — رنگ کا تھمنا بدن پر مانع پرواز تھا
ہجر میں سنتا کوئی کیونکر مری فریاد کو — دودِ دل ہنگام نالہ سرمۂ آواز تھا
تصویرِ رنگ دادہ ہوں دیکھو قرارِ دل — روکے ہے دوڑتے ہوئے خوں کو وقارِ دل
احساں نہ لے تو مثل ترا بھی کہیں نہیں — اکسیر ہے وہ خاک جو دامن نشیں نہیں،
بیقراری سبب بستگی خاطر ہے، — جب گرہ کھل گئی کچھ آنسوؤں کی دل ٹھہرے
وجودِ بحر جہاں ہے بقدر تاب و تواں، — بہت ہے یہ، جو کوئی دم حباب باقی ہے
آتش قدم ہوں قید عجب کا مقام ہے — زنجیر اشک ریختۂ موم خام ہے
دشتِ وحشت میں شرر اُڑتے تھے جب — برق اُلجھی تھی مری زنجیر سے

طنز طنزیہ انداز کا کلام ایک خاص صنف سخن ہے جو اگر صحیح طور پر صرف ہو جائے تو وجدان کو ایک خاص لطف و کیفیت بخشتا ہے۔ ماہر کے کلام میں یہ بہت حسن کے ساتھ استعمال ہوا ہے:-

جلجائے دل زبان سے عاشق نہ اف کریں — ارشاد ناز کا ہے ادا کا پیام ہے

عشاق کو یہ شرع محبت کا حکم ہے — گردن پہ ہو چھری تو تڑپنا حرام ہے

نہ آتے آپ جو دم کو تو اور کیا ہوتا — تڑپ تڑپ کے طبیعت سنبھل گئی ہوتی

عشاق پاس آکے یہ اُن کی بلا سنے — ہے ہے، ہے دل کی۔ ہائے جگر کی پکار ہے

مہربان چین جبیں کو مری رہنے دیجئے — کہیں مٹتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

خاک جس طرح جلا کر کئے دل لوگوں نے — ہم سے تو شمع بھی اس طرح جلائی نہ گئی

اسی کو اور زیادہ مخفی انداز سے یوں کہا ہے:۔

دل وہ تھے جن سے جلائی نہ گئی شمع کبھی — اور جو بھولے سے جلائی تو بجھائی نہ گئی،

نزع میں روتے ہو کیوں یاد کرو ہجر کے دن — دل مرا آج بھی گھبرائے تو گھبرانے دو

مجھ پہ تو طعن تھے آیا ہے اب آئینہ کیوں — دل جو تنہائی میں گھبرائے تو گھبرانے دو

ہر روز سرفراز تو کرنا محال ہے — اُس کو بھی کہئے عذر جو ہو گاہ گاہ میں

میں ہی تو تھا سبب استراحت عالم — مری ہی نیند کے اُڑنے سے سب کو خواب آیا

ستمگر دستم ایجادیاں چلی جائیں — نہ اُٹھ رہے کوئی بیداد آسماں کے لئے

رنگ الفت جو کوئی چیز نہیں، جانے دو — اک کلی دل بھی ہے، مرجھائے تو مرجھانے دو

ذکر بحرین تو ہوتا ہے سنا کر مجھ کو — خیر آنکھوں سے بھی دو اشک نکل جانے دو

محاکات

کسی کیفیت یا حالت کا اس طرح اظہار کہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور اُس کا تصور کامل دل میں پیدا ہو جائے "محاکات" ہے۔ اس کا مفہوم "منظر کشی" سے کسی حد تک وسیع ہے کیونکہ "منظر کشی" کا تعلق صرف حسیات سے ہوتا ہے۔ ماہر کے کلام میں محاکات کا جوہر اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

نازنیں ہاتھ سے شکنوں کو مٹایا جلدی — جب نشان وصل کے سمٹے ہوئے بستر میں رہے

دم نکلتے ہوئے دیکھا تو کہا گھبرا کر — ارے مجھ سے بھی تو کہدے کہ یہ کیا ہوتا ہے

اس کو کیا کہتے ہیں یوں جاگ کے کاٹیں راتیں — وصل کی شب جو ہوئی شام سے آرام کیا،

کچھ بھی ہے اعتبار تمھارے مزاج کا — آئے تو بے بلائے، بلایا تو ہٹ گئے

چاک ہونے کا یہ وحشت نے کیا تھا خوگر — ہاتھ سینہ تلک آیا کہ گریباں نکلا،

پھر پھر کے آپ سونگھ رہا ہوں میں اپنی بو — بازو پہ سر وہ رکھ کے جو لیٹے تھے خواب میں

برہم تو میری دید سے ہیں اُف رے بچپنا — آنکھوں پہ اپنے ہاتھ رکھے ہیں حجاب میں

تڑپوں میں وقت نزع نہ کیوں لیکے ہچکیاں — گھٹ گھٹ کے رو رہے ہیں بچھے وہ حجاب میں

ندرتِ اسلوب سیدھی سی بات ایک نئے انداز میں کہی جائے جو خاص کیف و اثر پیدا کر دے۔ ماہر کے یہاں یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو:-

(۱) تکمیل بربادی کی آرزو:-

نقش و نگارِ خاک سے صورت نما ہوں پھر ۔۔۔ آ اے ہوائے فنا کو ترا انتظار ہے،

(۲) ملامت گردوں کا شکوہ:-

شررِ و برق کو روکے، نہ کوئی پارے کو ۔۔۔ میرے دم بھر کے تڑپ لینے میں کیا ہوتا ہے

کوئی آزردہ ہے شمعوں سے نہ شبنم سے تنگ ۔۔۔ اک مرے رونے میں کیا جانیے کیا ہوتا ہے

(۳) دل گمشدہ کی یاد:-

خیال دل سے مجھے یادش بخیر آتا ہے ۔۔۔ چراغ جل کے مرے سامنے بجھا نہ کرے

(۴) ناوک قاتل کا استقبال:-

لے وہ پیکاں سر ناوک قاتل آیا ۔۔۔ پیشوائی کو بڑھا اے آہ، مرا دل آیا،

(۵) منزل آخرت کی صعوبت:-

جانے والو سفر قبر کی سختی دیکھو ۔۔۔ بارِ جاں پھینک کے رہرو سوئے منزل آیا

(۶) ابرو و شمشیر کی مشابہت:-

ابرو کی جنبشوں پہ جو چاہو وہ اب کہو، ۔۔۔ سیکھے ہو یہ ادا مجھے تلواریں مار کے

(۷) حیات بخشی کی آرزو:-

گریا دعا دیتیں ہوں تو شانہ ہلا دو تم ۔۔۔ کچھ سو رہے ہیں چین سے مہماں مزار کے

(۸) دفن:-

سب مل کے دفن خاک کے پتلوں کا دیکھ لیں ۔۔۔ خشکی میں ڈوبتے ہیں سفینے غبار کے

(۹) تقاضائے وصل:-

انکار میرے گھر سے فقط سن کا ہے سبب ۔۔۔ دل میں اگر رہے تو مری جاں کہاں رہے

(۱۰) جوابدہی سے معذوری:-

جواب دوں تجھے اے عیب پوش بھیڑ میں کیا ۔۔۔ گنہ کی طرح سے گھیرے ہیں اہلِ محشر بھی

(۱۱) خواہش دیدار:-

اُلٹو نقاب مُنہ سے دکھا بھی چکو جمال ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ کہیں تم حسیں نہیں

جذبات کی تحلیل شاعری کی "کارگاہ شیشہ گری" میں یہ کام بڑا نازک ہے۔ اس کے لئے صحیح فطرت کی نباضی کی ضرورت ہے۔ ماہر اکثر اس مرحلہ میں کامیاب ہوئے ہیں:۔

سب اسیران قفس دیکھ کے رہ جاتے ہیں　　ساتھ والوں سے اگر کوئی رہا ہوتا ہے
آئینہ لیکر میں اُن کے ہاتھ سے نادم یہ ہوں　　ایسی ہی کوئی ادا تھی جس پہ اُن کو ناز تھا

میں سمجھتا ہوں کہ ماہر کی کائنات شاعری میں ایک یہی شعر ناز کے لئے کافی ہے:۔

میرے آگے تیلیاں توڑیں نہ قیدیِ قفس　　زورِ بازو پر کبھی مجھ کو بھی اپنے ناز تھا
دوستوں نے بھر کے آہ سرد میری جان لی　　شمع کے پروانے بھی دشمن تھے صرصر کی طرح
صیاد کی تسلیوں کا اعتبار کیا،　　کھڑکی کھلے قفل کی تو سمجھیں کہ ہاں چلے،

منظر کشی حیات کی اجتماعی صورت اس طرح نظم ہو جائے کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھرنے لگے:۔

پچھلے سے مست بیٹھے ہیں اس انتظار میں　　پھولے شفق تو جام مئے ارغواں چلے
یہ شکل اُن کی دم صبح شام وصلت ہے　　نگاہ نیچی ہے، بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے
وہی ہیں میرے جنازے پر آج آئے ہوئے　　ادھر جو دیکھتے ہیں منہ اُدھر پھرائے ہوئے
سب کے ہمراہ جھکے دیکھ رہے ہیں وہ بھی　　جان کا میری نکلنا بھی تماشا کیا ہے'
رندان بادہ کش نے کھولے قبا کے بند　　پنکھے چلے جہاں میں جو ابرِ بہار کے
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں تکیہ پہ سر نہیں،　　کیا کر رہی ہے کس کی نظر کچھ خبر نہیں
لڑ بھڑ کے کس سے سوئے ہیں کس سے بگاڑ ہے　　کون اُن کی لے رہا ہے بلائیں خبر نہیں

حکیمانہ وعظ و نصیحت اور اخلاقی شاعری یہ چیز غزل کے اصل مفہوم سے تو خارج ہے مگر اساتذہ نے اصطلاحی غزل کے ذیل میں اس کی جگہ نکال کر شاعری کو کارآمد بنا دیا ہے۔ ماہر کے یہاں تشبیہات و استعارات کے ماتحت اور کائناتِ عالم سے نتیجہ اخذ کرنے کے ذیل میں جسے میں ماہر کا مخصوص رنگ سمجھتا ہوں اور جس کا ذکر آئندہ کروں گا۔ موعظہ و نصیحت اور اخلاق کا ذخیرہ بڑی کثرت کے ساتھ ہے مگر میں اس مقام پر خالص وہ اشعار پیش کروں گا جن میں براہ راست یہی ہے اور کچھ نہیں، اس سے آپ کو خود ماہر کے طبعی رجحان اور اخلاقی میلانات کا پتہ بھی لگیگا۔ فرماتے ہیں:۔

کان رکھکر نہ کبھی میں نے سنی بات اُس کی　　آدمیت سے جو خارج کوئی انساں دیکھا
منعموں کے گھر بنانے کا نتیجہ یہ ہوا　　آپ سوئے کنج مرقد میں عمارت رہ گئی
انہی باتوں پہ ہے ماہر تجھے مطلب کی طلب　　منہ سے مانگا تو دل آگاہ دعا سے نہ ہوا

جس کو ہنگام دعا شغل نظر بازی رہا
چشم بنکر قفل درہائے اجابت رہ گئی

فاش پایا جبکہ رازِ عسرت ارباب فقر
پردہ رکھ لینے کو دنیا میں قناعت رہ گئی

اپنا ثبات بحر جہاں میں نہ جان تو
مٹتا ہے جلد نقش جو آبِ رواں میں ہے

دیکے کچھ اس پیشکش کو کرے او منعم قبول
آبرو سی چیز کشتیِ کفِ سایل میں ہے

نہ دیکھو گر تو ہوں کم ظرف مثل جام جم بیشک
اگر دیکھو تو گنجایش ہے مجھ میں ایک عالم کی

فقیری قناعت کا باعث ہوئی
بری بھی تو اچھی بسر ہوگئی

ہے آبرو کی طلب گر تو کر ہنر حاصل
بقائے بو ہے تو قدرِ گلاب باقی ہے

نہ فیض پائیگا اس خاکداں سے او غافل
سراب پر تجھے امید آب باقی ہے

نہ تن کے دیکھ ہر اک بار حسن کو غافل
یہ آب و تاب بدن تا شباب باقی ہے

جھک کے چل ماہر ہر اک سے رہ گزارِ دہر میں
کھائی ہے ٹھوکر اُنھوں نے جو اُٹھا کر سر چلے

(باقی) ع - ن

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین محمد علی:- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ - یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ قیمت مجلد ع؎

مضامین رشید:- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تروتازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ع؎

میدان عمل:- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو ان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ع؎

بیوہ:- منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ

منیجر نگار لکھنؤ

اپنے ایک اشتراکی دوست سے!

دسمبر کے نگار میں "معراجِ تمدن" کی سرخی سے ایک مضمون میری نظر سے گزرا۔ مقالہ نگار کا روئے سخن میرے دو گزشتہ مضامین کی طرف ہے۔ جواب الجواب کا میں قایل نہیں ہوں۔ لیکن معترض نے میرے مضامین سے دو تین حوالے جو نقل کئے ہیں ان میں تغیر و تبدل کر دیا ہے۔

مقالہ نگار نے مجھ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مینے نہ اشتراکیت کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور نہ کسی اشتراکی سے مجھے تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا ہے، ورنہ میں نازیت و فاسیت کو اشتراکیت کے ساتھ ملا کر نہ دیکھتا۔ خاکسار کے جہل کے متعلق معترض کا ارشاد بجا اور درست ہے، لیکن باادب گزارش ہے کہ مقالۂ مذکور میں اشتراکیت۔ نازیت اور فسطائیت کو ایک ثابت کرنے کی میں نے ایک جگہ بھی کوشش نہیں کی ہے۔ میرے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ "لیکن اس کے بعد ہی ایک دوسری چیز جمہوریت کی حریف بن کر آ کھڑی ہوئی - - - - - جسے کہیں نازیت کہتے ہیں، کہیں فاسیت اور کہیں بالشیوزم اور ہر جگہ اس کا آلۂ کار بھی - - - ایک ہی ہے یعنی شخصِ واحد یا ایک منظم جماعت کی مطلق العنانی"

آگے چل کر مقالہ نگار نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ "مینے جمہوریت کا مفہوم آزادانہ رائے دہندگی تک محدود کر دیا ہے" حالانکہ جمہوریت کی تعریف میں نے یہ کی ہے "کہ عنانِ حکومت عوام کے ہاتھ میں آ جائے اور حکومت کا ہر کام عوام کے مشورہ سے عوام کے ہاتھوں اور عوام کے فایدے کے لئے کیا جائے"

اس کے بعد میں نے موجودہ جمہوری ریاستوں کے نظام (Constitution) پر ایک طایرانہ نظر ڈالی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے اسی سے معترض کو غلط فہمی ہو گئی اور انھوں نے سمجھ لیا کہ امریکہ انگلستان یا فرانس کی حکومتوں کو میں جمہوریت کا معیار قرار دے رہا ہوں۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے جمہوریت کے کھوکھلے پن کو دکھایا ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اعتراضات نفسِ جمہوریت پر کئے جا رہے ہیں یا ان ریاستوں پر جو اپنے جمہوری ہونے کے مدعی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جمہوری اُصول پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جمہوری حکومتوں ہی پر نکتہ چینی کی گئی ہوگی لیکن اس کی کیا ضرورت تھی جبکہ میں خود لکھ چکا تھا کہ حقیقتاً امریکہ اور انگلستان تک جمہوریت سے عاری نظر آتے ہیں اگر امریکہ میں دولت کی پرستش ہو رہی ہے تو انگلستان میں بھی قدیم روایات کا بت لوگوں سے ابتک سجدۂ عبودیت وصول

کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتک صرف سیاسیات میں جمہوریت کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن تاوقتیکہ اجتماعیات کے ہر شعبے میں جمہوری نظام نہ قایم ہوجائے۔ جمہوریت کی کامیابی دشوار ہے اور گارنر کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جمہوریت بیک وقت ایک سیاسی نظام بھی ہے، معاشرتی اصلاح بھی ہے اور مذہبی تخیل بھی۔

اس کے بعد معترض نے چند تنقیحات قایم کرکے ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ تنقیحات اور ان کے جواب اسی قسم کے ہیں جو حامیانِ اشتراکیت کی نوکِ زبان رہا کرتے ہیں اور جو عموماً سطحی ہوتے ہیں کیونکہ ننانوے فی صدی اشتراکی علمی حیثیت سے بہت پست ہوتے ہیں اور بغیر کافی تعلیم حاصل کئے ہوئے معلمانہ اندازِ گفتگو اختیار کر لیتے ہیں۔

موجودہ نظامِ معاشرت کی خامیوں سے کون انکار کر سکتا ہے اور اس کی ناانصافیوں کی کون حمایت کرے گا؟ اسی لئے سرمایہ داروں اور طبقۂ امرا کے مظالم پر جب ان کی نظر پڑتی ہے تو ان کے جذبات اس طرح اُبھر آتے ہیں کہ غور و فکر کی صلاحیت بالکل رخصت ہوجاتی ہے اور بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اشتراکیت یا اشتمالیت قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں، یہ حضرات اسی طرف مایل ہوجاتے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر جب کوئی چیز مسلط ہوجاتی ہے تو اس کے معائب پر نظر کم پڑتی ہے۔ اسی بنا پر اگر میں یہ کہوں کہ اشتراکیت سے اکثر اشتراکی خود نابلد ہیں تو اسے مبالغہ نہ سمجھنا چاہئے۔ مارکس اور انجل کے نام تو اشتراکیوں کے زبان پر ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو مارکس کو سمجھ سکتے ہوں؟ بہت سے تو ایسے ملیں گے جو مارکس کی تصانیف سے بھی ناواقف ہوں گے۔

موجودہ دور کی اشتراکیت تمام و کمال معاشیات کے نظریوں پر قایم ہے (موجودہ دور کی تخصیص سے اشتراکی متعجب نہ ہوں۔ اس شریعت کا پیغمبر صرف مارکس ہی نہیں۔ بلکہ اس کے قبل بیسیوں اور بھی گزر چکے ہیں، چنانچہ خود افلاطوں بہت بڑا اشتمالی تھا) لیکن ان بزعمِ خود ہمہ داں اشتراکیوں کو اس خارزار میں قدم رکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔

روس کی کامیابیوں کو اشتراکیت کی کامیابی بتانا بھی ہمارے ایسے ہی مداحانِ اشتراکیت کا کام ہے۔ شاید ان حضرات کو خبر نہیں کہ جس روز لینن نے وہاں (New Economic Policy) کا نفاذ کیا، اسی روز اشتراکیت کی بنیادیں ہل گئیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اب وہ اسٹالن کی موجودہ پالیسی کو کس قسم کی اشتراکیت کہیں گے۔ میری مراد سیاسی نہیں بلکہ اس کی اقتصادی پالیسی سے ہے جو بیس سال کی طویل کوششوں کے بعد اسٹالین نے اعترافِ شکست کے طور پر پیش کی ہے اور جس میں ذاتی جائیداد و املاک رکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے؟ تجارت کرنے اور کارخانے قایم کرنے کے لئے بھی عوام کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

روس کی ترقیوں کا میں منکر نہیں ہوں اور نہ اس کے کارناموں کو میں جھٹلانا چاہتا ہوں۔ میری تو غرض اتنی

ہے کہ اس کا راز نہ اشتراکیت میں پنہاں ہے اور نہ بولشوزم میں - بلکہ لینن اور اسٹالین کی اپنی مخصوص فطری صلاحیتوں میں، اور روس کی نیم وحشی آبادی میں -

اسے روس کی خوش نصیبی کہئے کہ اسے لینن اور اسٹالین ایسے رہبر مل گئے اور یہ ان دونوں کی خوش بختی تھی کہ انھیں تختۂ مشق بنانے کے لئے ایسا ملک ہاتھ آ گیا جو مطلق العنانی کی ہر صدا پر لبیک کہنے کے لئے پشتہا پشت سے عادی تھا - روس کی یہ نئی کایا پلٹ اشتراکیوں کے لئے واحد معجزہ ہو تو ہو - لیکن تاریخ اسی روس میں ایسے ہی دو اور معجزوں کا پتہ دیتی ہے - ایک ۹۸۸ء میں - جبکہ (Vlademir) نے خود بھی مسیحیت قبول کی اور روسیوں کو بھی ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا - دوسری مثال تو بہت حال کی ہے یعنی پیٹر اعظم کے اصلاحات - کیا تاریخ روس کے یہ دونوں واقعات انقلاب سے کم درجہ رکھتے ہیں؟ اور کیا ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی طرح عوام ان پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں کئے گئے تھے؟

بیرونی دنیا کے لئے انقلاب روس کوئی اہمیت نہیں رکھتا - بیسویں صدی کے آغاز سے، خاندانِ آدم کا وہ طبقہ جو اب تک کچلا جا رہا تھا اس پر تلا ہوا نظر آ رہا تھا کہ اپنے حقوق منوا کر رہے گا - جنگِ عظیم کا نشتر خاطر خواہ فائدہ نہ پہونچا سکنے پر بھی بالکل رایگاں نہ گیا اور بہتیرے ملکوں سے صدیوں کے منجمد موادِ فاسد کو نکال دینے میں کامیاب ہوا - اقوامِ عالم خوابِ غفلت سے آنکھ ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور حصولِ مقصد کے لئے سبھوں نے الگ الگ لایحۂ عمل مقرر کیا - چین - جاپان - روس - ایران - ترکی - اٹلی وغیرہ وغیرہ سبھوں نے اپنے حیاتِ نو کے لئے علحدہ علحدہ اور نئی نئی شرعیتیں ایجاد و اختیار کیں - اس میں کون ناکامیاب رہا اور کون کامیاب اس کا فیصلہ آنے والے مورخین کریں گے - میں تو اسے صرف اتفاق ہی کہوں گا کہ روس میں کرینسکی حکومت (Kerensky Govt:) کو اپنی اندرونی نااتفاقیوں کی باعث، لینن کے ہاتھوں شکست ہوئی اور روس کی ساری ترقیوں اور کامیابیوں کا سہرا لینن کے سر رہا، کیونکہ انقلاب روس کے بعد خواہ کوئی بھی حکومت ہوتی اس کی ترقی کی داستان وہی ہوتی جو آج ہے - اور اگر نہیں تو ہمارے اشتراکی حضرات ایران - ترکی - اٹلی - جاپان کی کامیابیوں کے لئے کونسی تاویل پیش کرتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ اسکا جواب اشتراکی یہی دیں گے کہ "روس کے دوش بدوش دوسرے ممالک کو کھڑا کرنا عین حماقت اور جہالت ہے کیونکہ روس اور ان ممالک کی حکومتوں میں "چند اصولی اختلافات ہیں" ان کے یہاں ریاست ہی سب کچھ ہے - روس کے یہاں ریاست کوئی چیز نہیں - وہاں ادنیٰ اور اعلیٰ کے لفظ لایعنی نہیں ہیں، وہاں طبقوں کی بلندی اور پستی متعین چیز ہے، لیکن روس میں نہیں - الغرض دونوں میں اُصولی اختلافات ہیں -

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک اُصول وضع کرنے کا تعلق ہے میں کیا ہر شخص انھیں بے تامل قبول کریگا - لیکن یہاں بحث اُصول سے نہیں بلکہ ان پر عمل کرنے سے ہے - اعتراضات دو قسم کے ہیں - ایک تو یہ کہ ان

اُصول میں کچھ تو قطعی ناقابلِ عمل ہیں اور بعض ایسے ہیں جنھیں قابلِ عمل تو کہا جا سکتا ہے، لیکن درحقیقت ان پر عمل نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا اُصول کی حقیقت نمبروار ملاحظہ ہوں:۔

نمبر ۱۔ دوسری حکومتیں انسانی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں قبول کرتیں، کہ کبھی انسان اس منزل تک پہونچ سکتا ہے، جب اسے ریاست کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کے برعکس کارل مارکس کا خیال تھا کہ ضرورت اور افلاس ہی ام الخبائث ہے خواہ افراد ہوں یا اقوام دونوں کے ارتکابِ جرم کی باعث یہی ضرورت ہوا کرتی ہے اگر ضرورت یعنی افلاس کا خاتمہ کر دیا جائے تو دنیا کو نہ پولیس کی حاجت رہ جائے گی اور نہ فوج کی اور چونکہ اشتمالیت اسی افلاس کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا ذمہ لیتی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ریاست کا آلۂ جبر و احتساب عضوِ معطل ہو کر نہ رہ جائے۔ چونکہ روس بھی صحیفۂ کارل مارکس کا پیرو ہے، اس لئے وہ بھی مدعی ہے کہ رفتہ رفتہ وہ اس معراج تک پہونچ جائے گا۔ بفرضِ محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مارکس کا یہ ہوائی قلعہ عملی جامہ پہن بھی سکتا ہے تو اس کے لئے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ ساری دنیا مارکس کی پیرو ہو جائے اور ایک دفعہ روسو (Rousseau) کی ذہنی (State of nature) تمام روئے زمین پر ساری وطاری ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے لینن نے ساری دنیا کو اشتمالی بنا دینے کی کوشش کی تھی اور ایک کامیاب انقلابِ عالم کا خواب دیکھنے لگ گیا تھا۔ لیکن بہت جلد اس تجویز کی حماقت اس پر ظاہر ہو گئی اور اُسے کنارہ کش ہو جانا پڑا لیکن بطور آئیڈیل یہ اُصول اب بھی روس میں موجود ہے۔ اور اشتمالی کم از کم اس کا خواب ضرور دیکھ لیا کرتے ہیں۔

نمبر ۲۔ بلند و پست کی تفریق غیر فطری ہے۔ اس کو فنا کر کے سبھوں کو مساوی حقوق دینا چاہئے۔ غیر اشتراکی دنیا اب بھی اس پر مصر ہے کہ خواہ کچھ بھی کیا جائے بلند و پست کی تفریق نہیں مٹائی جا سکتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کل کا اعلیٰ طبقہ آج ادنیٰ ہو گیا۔ اسی طرح آج کا ادنےٰ کل اعلیٰ ہو جائے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ سب ایک ہی سطح پر لا کر کھڑے کر دئے جائیں۔ خود روس میں کیا ہوا؟ یہ تو درست ہے کہ زار کے وقت کی اشرافیت اب وہاں باقی نہیں ہے۔ لیکن کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ اس کی جگہ ایک دوسری ذرا پست درجہ کی اشرافیت پیدا نہیں ہو گئی۔ آپ لاکھ انسانیت پرست بن جائیں لیکن پست کاموں سے جو ذہنی پستی پیدا ہو جاتی ہے اُسے کیسے دور کر دیں گے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور، انجنوں میں کوئلہ جھونکنے والا انسان، یا صحرائے گوبی میں جانوروں کا گلہ بان، اسی قسم کی زندگی بسر کرنے لگ جائے گا جیسا کہ مابعد الطبیعات کا ایک معلم سائنس کا ریسرچ سکالر یا کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری بسر کرتا ہے۔ عموماً اشتراکیت پسند جماعت اس کا یہ جواب دیتی ہے "یہ کون کہتا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر تو صرف روٹی کا سوال ہے۔ اشتراکیت کا مقصد تو صرف اکثریت کو افلاس اور فاقوں سے بچانا ہے۔ پھر چونکہ افلاس نام ہے ضروریاتِ زندگی کی عدم فراہمی کا اور امارت نام ہے لوازمِ زندگی کا بہ افراط پائے جانے کا، اس لئے اشتراکیت

انھیں دونوں میں توازن پیدا کر دینا چاہتی ہے۔

اگر اشتراکیت صرف اتنے ہی کے لئے کوشاں ہے۔ تو باادب گزارش ہے کہ دوسری ریاستوں کو تو چھوڑیے خود جرمنی اور اٹلی میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے وہاں بھی ذاتی جایداد اور املاک پر اگر کلیتاً نہیں تو کافی حد تک ریاست کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ساہوکار اور کارخانوں کے مالکوں پر بہت کچھ پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں (Labour Legislation) کی ہمہ گیری دن بدن بڑھتی جا رہی ہے آمدنی اور سرمایہ پر ٹیکس۔ بڑھاپے اور علالت کا بیمہ۔ جسمانی خطرات اور نقصانات کے لئے تاوان وغیرہ سب اسی مقصود کے حصول کے ذریعے ہیں اور جب زمانہ کی رفتار کا یہ رخ ہو اور ہم سب تدریجاً اشتراکیت کی طرف گامزن ہوں تو محض اصطلاح پر جھگڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظامِ سرمایہ داری پر اشتراکیت کی اکثر نکتہ چینیاں قابلِ قدر ہیں۔ لیکن انقلابِ روس اور سوویٹ نظامِ حکومت کے بغیر بھی یہ خامیاں ظاہر ہو کر رہتیں کیونکہ آزاد سرمایہ داری کی تباہ کاریاں ایسی نہ تھیں کہ چھپائے چھپ جاتیں۔

نمبر ۳ - غیر روسی اشتراکی اس پر بہت زور دیتے ہیں کہ حقیقی معنوں میں جمہوریت روس ہی میں ہے۔ کیونکہ دوسری ریاستوں کی طرح یہاں کی حکومت سرمایہ داروں کی دست نگر نہیں ہے بلکہ حکومت پر سوویٹ کو اقتدار کلی حاصل ہے نیز غیر ممالک کی طرح یہاں حکومت کی مشین اوپر سے نیچے نہیں آتی بلکہ نیچے سے اوپر جاتی ہے۔ یہاں کے Local bodies (پنچایت - یونین بورڈ - لوکل بورڈ - ڈسٹرکٹ بورڈ) سے بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں اور ان کے فرائض بھی انھیں جیسے ہیں۔ دیہاتوں، قصبوں، کارخانوں، چھوٹے شہروں سے سوویٹس کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان کے اوپر ضلع اور صوبہ کے سوویٹس ہوتے ہیں اور سبھوں کے اوپر کونسل آف سوویٹس (Council of Soviets) قایم ہے۔ یہی یہاں کی مجلسِ قانون ساز ہے۔ اور ملک کی کیبنٹ (The council of Peoples Commissars) کا بھی یہی انتخاب کرتی ہے سوویٹس کے ممبروں کا انتخاب الکشن کے مروجہ قاعدے کے مطابق نہیں ہوتا۔ بلکہ سوویٹ کا صدر، عام میٹنگ میں، امیدواروں کے نام پیش کرتا ہے۔ ان کی موافقت میں تقریریں ہوتی ہیں۔ حکومت کے کارنامے پیش کئے جاتے ہیں اور آخر میں حاضرین سے ہاتھ اٹھوا کر ممبروں کے انتخاب ہو جانے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ عوام الناس کے اثر و اقتدار کو بڑھانے کی دوسری قابلِ ذکر چیز اجتماعیت ہے (Collectivism) ہے جس کو حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اندرونی انتظامات بالخصوص کارخانوں اور کاشتکاری کا نظم و نسق یہاں اسی کے ذمہ ہے سمجھنے کے لئے اسے (Board of Directors) کہ لیجئے لیکن دونوں میں یہ فرق ہے کہ یہاں ممبران تمام و کمال کارخانے کے مزدوروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور کارخانہ کے نفع و نقصان سے انھیں بحث نہیں

ہوتی۔ ان کا کام صرف انتظام کی دیکھ بھال ہے اور جہاں تک اپنے مخصوص کارخانے کا تعلق ہے وہ Trade Unions کی خدمت بھی یہی انجام دیتے ہیں اور اس طرح سوویٹ پر بھی ان کا کافی اثر رہتا ہے۔

یہاں میں نے محض ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ حقیقت کو بے نقاب کروں پہلے سوویٹ کے طریقۂ انتخاب پر بھی ایک بے لاگ نظر ڈال لیجئے۔ پہلی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ممبروں کے انتخاب کا حق صرف مزدور، کسان اور فوج کو حاصل ہے دوسرے طبقوں سے قطع نظر اس کو بھی ایک حد تک (Universal Adult Suffrage.) کہہ سکتے ہیں لیکن تاوقتیکہ انتخاب کرنے والی جماعت کو اتنا علم و شعور نہ ہو کہ وہ اچھی طرح "حکومت اور انتخاب" کے معنی سمجھ سکے عام رائے دہندگی کا حق لایعنی سی بات ہے۔ چنانچہ مل نے کہا تھا۔ "عام رائے دہندگی کے لئے عام تعلیم لازمی شرط ہونی چاہئے"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسوقت کسی امیدوار کا نام پیش کر کے ایک جادو بیان مقرر حاضرین کے جذبات مشتعل کر دیتا ہے تو غیر ارادی طور پر بھی اس کی حمایت میں ہاتھ اُٹھ ہی جاتے ہیں۔ مزید براں ووٹ بر سرِ عام لئے جاتے ہیں۔ امیدوار حکومت کا منتخبہ آدمی ہوتا ہے اور انتخاب کرنے والوں میں بھی ایک جماعت حکومت کی حمایتی ہوتی ہے جو ہر ممکن پروپگنڈے سے کام لیتی ہے۔ نیم خواندہ یا جاہل عوام کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ عاقل اور پڑھے لکھے تک اس ماحول اور ایسی فضا میں حق و ناحق میں تمیز نہیں کر سکتے اور (mass Psychology) کے غلبہ میں آ ہی جاتے ہیں ممکن ہے کہ کچھ غیر معمولی فہم و فراست کے لوگ اس طوفانِ بدتمیزی میں بھی اپنے ہوش و حواس درست رکھ سکیں، پھر بھی حکومت کے خلاف کب آواز بلند کر سکیں گے؟ اور اگر بفرضِ محال یہ بھی مان لیا جائے تو پھر وہاں ان کی سنتا کون ہے؟

یہ اُصولی اعتراض تھا لیکن درحقیقت روس میں اتنا بھی نہیں ہوتا۔ کہنے کے لئے تو حکومت سوویٹس کے قبضہ میں ہے اور سوویٹس پر "کلکٹوز" قابض ہیں۔ لیکن واقعتاً وہاں (Communist Party) مطلق العنانی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ روس میں اسٹالین کیا حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اکثر حضرات کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اسے روسی حکومت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ وہ محض کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری ہے۔ پھر پارٹی کے ممبران کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اتنے منظم ہیں کہ کلکٹو اور سوویٹ میں ان کے سوا دوسرے کی رسائی نہیں ہوتی پھر یہ بات بھی نہیں کہ صرف ان کی تنظیم یا بے لوث خدمت قوم انھیں برسرِ اقتدار کئے ہوئے ہے، بلکہ اس پارٹی کی قوت کا راز روس کی خفیہ پولیس یعنی (O.G.P.U.) میں پوشیدہ ہے۔ جس کے مظالم کی داستان لیول کے ہیبتناک افسانوں سے کم روح فرسا نہیں، حکومت یعنی پارٹی کے خلاف کسی کی مجال نہیں کہ اشارتاً بھی کچھ کہہ سکے۔

روسی قتلِ عام کی داستانوں سے کون واقف نہیں؟ ملک میں اخبارات بھی ہیں۔ جلسے بھی ہوتے ہیں۔ تجویزیں بھی پاس کی جاتی ہیں، لیکن ہوتا وہی ہے جو حکومت چاہتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ روس میں عوام

کی زندگی وبالِ جان ہوگئی ہے ملک اس قید و بند کی وجہ سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ روسی صدیوں سے اسی قسم کی زندگی کے عادی ہیں۔ زار کے زمانہ میں بھی حکومت کے خلاف لب کشائی ناممکن تھی، اسی وقت بھی شاہی پولیس کے مظالم کچھ کم نہ تھے اور دوسری قسم کی پابندیاں بھی آج کی پابندیوں سے کہیں زیادہ تھیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ روس کے لیے زار کی حکومت کے مقابلہ میں بولشیوک حکومت ہر لحاظ سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔

اب روس کی اس کمیونسٹ پارٹی کا جرمنی کے نازی اور اٹلی کی فاسسٹ پارٹی اور ان کا حکومت پر جو اقتدار ہے اس سے مقابلہ کیجیے تو یہ تمیز بھی دشوار ہو جائے گی کہ کون کس کا چربہ ہے۔

یہاں میں نے صرف تین ہی اصول سے بحث کی ہے لیکن انھیں اصول کو لیا ہے جو اشتراکیوں کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ بہرحال میرا مقصد صرف یہ دکھلانا ہے کہ کوئی حکومت محض اچھے اصول بنا کر کامیاب اور دوسروں کے لئے قابلِ تقلید نہیں ہو سکتی۔

گلاب چند

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ:- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے قیمت ۲ر

دیہی جنس:- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے از جی۔ سی کمار پالتا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ:- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور ان کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے قیمت ۴ر

شہری آزادی:- اس کتاب میں بیرونی ممالک کے انجمنوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے قیمت ۴ر

ہندوستان میں برطانوی حکومت:- از ڈاکٹر زین العابدین صاحب یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن یہ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے۔ اسکے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے۔ جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

منیجر نگار لکھنؤ

دنیائے آب کی کہانی

کرۂ زمین کا چوتھائی حصہ خشکی ہے باقی تین چوتھائی پانی۔ حصۂ آب کا رقبہ ۱۴ کروڑ مربع میل سے زیادہ ہے جو زمین کے شمالی حصہ میں ۶۱ فی صدی پایا جاتا ہے اور جنوبی حصہ میں ۳۹ فی صدی۔

ہر سال پانی کی ایک تہ ۱۲ فٹ ۹ انچ کی موٹی، بھاپ بنکر اُڑ جاتی ہے، گویا بہ الفاظ دگیر یوں سمجھئے کہ ...،...،...، ۵۲ فٹ مکعب، یا ...،...،...، ۱۵۰۰۰ ٹن پانی ہر سال سورج کی گرمی کے نذر ہو جاتا ہے جسکی تلافی بارش اور دریاؤں سے ہوتی رہتی ہے۔ قطبین کے علاقہ میں پانی ایک اور شکل میں بھی پایا جاتا ہے، جس کا نام تودۂ برف ہے ان تودوں کا نہایت ہی تھوڑا حصہ ہر سال پگھلتا ہے، ورنہ اگر یہ تمام تودے پگھل جائیں تو سوائے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کے ہماری دنیا غرقِ آب ہو جائے۔

سب سے بڑے تودے، گرین لینڈ کے سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کو یہ سُن کر شاید حیرت ہوگی کہ گرین لینڈ کا سمندر بعض جگہ چھ ہزار فٹ کی موٹی تہ میں چار چار لاکھ مربع میل تک منجمد ہو جاتا ہے اور اس سے تقریباً ایک ارب ٹن پگھلا ہوا پانی ہر سال سمندروں میں پہونچتا رہتا ہے۔

برفیلے تودوں کی تعداد، جو شمال سے جنوب کی طرف بہہ کر آتے ہیں، اوسطاً ۴۰۰ ہے اور اس وقت تک سب سے بڑا تودہ، ۶۵ فٹ اونچا اور ۱۷۰۰ فٹ لمبا دیکھا گیا ہے جس کا وزن کروروں ٹن ہونا چاہئے، جب ۱۹۱۲ء میں ٹیٹانک جہاز برف کے تودوں سے ٹکرا کر غرق ہوا تو تودوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی جماعت مقرر کی گئی تاکہ انکو توڑتی رہے اور جہازوں کی آمد و رفت مخدوش نہ رہے، لیکن پوری طرح اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ایکبار وقتِ واحد میں پانچ سرنگیں لگا کر ایک تودہ کو اُڑانا چاہا لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ تودہ میں صرف پندرہ فٹ گہرا اور ۲۰ فٹ لمبا سوراخ پیدا ہو سکا۔ ایک مرتبہ بہت زیادہ قوی ڈائنا میٹ بجلی کے ذریعہ سے استعمال کیا گیا، لیکن اس نے بھی کوئی اثر نہ کیا۔

تودوں کا بہت بڑا حصہ (تقریباً ۸۰ فٹ کا) پانی کے نیچے رہتا ہے، اس لئے جب وہ کبھی سمندر کے گرم چشموں میں پہونچ جاتے ہیں، تو پگھلنے لگتے ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔

سمندروں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ کبھی وہ خشک ہوسکتے ہیں بالکل مہمل ہے، بعض کا خیال ہے کہ سمندروں کا جتنا پانی بھاپ بنکر اُڑتا ہے، اتنا انھیں واپس نہیں ملتا۔ بعض کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ سمندروں کے پانی کے دباؤ سے کسی وقت زمین کا شق ہوجانا بھی ممکن ہے۔ ایک امریکن ماہر کا بیان ہے کہ ان بلورات کے لئے جو سمندروں کی تہ میں بنتے رہتے ہیں پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور جتنا پانی ان میں ہر سال صرف ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ سمندر کا پانی ہر سال دس انچ کم ہورہا ہے اور اس طرح گویا بارہ ہزار سال میں اسے خشک ہوجانا چاہئے، لیکن آسٹریا کے ایک ماہر کی رائے اس کے خلاف ہے وہ کہتا ہے کہ گزشتہ دس ہزار سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ سمندروں کے پانی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، اس لئے یہ خیال کہ کسی وقت سمندر خشک ہوجائیں گے بالکل بے معنی ہے۔

کرۂ ارض کے پانی کی تقسیم جغرافیہ والوں نے مختلف سمندروں کے نام سے کی ہے۔ تین بڑی بڑی تقسیمیں یہ ہیں بحر پاسفک، بحر اٹلانٹک، بحر ہند۔ بعض نے قطبین کے حصۂ آب کے بھی علحدہ نام رکھے ہیں، لیکن حقیقتاً وہ بھی انھیں تینوں سمندروں کے حصے۔

ان سمندروں میں بحر پاسفک سب سے بڑا اور بہت زیادہ گہرا سمندر ہے۔ شمالاً جنوباً ۹۶۳۰ میل تک چلا گیا ہے اور شرقاً غرباً ۱۰۶۰۰ میل تک۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۱۴۰۰۰ فٹ سے کچھ زاید ہے۔ سواحل جنوبی امریکہ کی طرف اس کی گہرائی ۱۸ ہزار سے ۲۵ ہزار فٹ تک دریافت ہوئی ہے اور جزایر فلپائن کے پاس ۳۵ ہزار فٹ تک۔ یعنی اگر ایورسٹ کی چوٹی جو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے اس حصۂ آب میں ڈالدی جائے اور اس کے اوپر برطانیہ کا سب سے اونچا پہاڑ، بن نوس (Ben Nevis) اُٹھاکر رکھدیا جائے، تو بھی دو ہزار فٹ پانی ان کے اوپر نظر آئے گا۔ نیوزیلینڈ کے شمال مشرق اور جزیرہ گوام (Guam) کے قریب بھی جو جزائر فلپائن کے پاس ہے ۳۱ ہزار فٹ تک گہرائی دریافت کی گئی ہے۔

بحر پاسفک کا پچاسواں حصہ ایسا ہے جو ۲۳ ہزار فٹ سے زیادہ گہرا ہے اور ایک چوتھائی سے زیادہ ۱۶ اور ۲۰ ہزار فٹ کے درمیان گہرا ہے۔

ایک مسافر جو شمالی افریقہ سے ہندوستان کی طرف سفر کرتا ہے، وہ بحر ہند میں اکثر یہ نظارہ دیکھتا ہے کہ رنگین روشنیاں پانی کی موجوں سے کھیل رہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب برشگالی ہوائیں سمندر میں تموج پیدا کردیتی ہیں اور بڑی بڑی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں تو آفتاب کی روشنی ان میں یہ گل کھلاتی رہتی ہیں۔

بحر ہند کی گہرائی کا اوسط ۱۳ ہزار فٹ ہے گویا بحر اٹلانٹک کی گہرائی کے اوسط سے ۱۲۰ فٹ زیادہ۔ چھوٹے سمندروں میں آرکٹک کی گہرائی کا اوسط سب سے کم ہے یعنی ۴ ہزار فٹ۔ بحر روم کی گہرائی کا اوسط اس سے ۱ ہزار فٹ زیادہ ہے

سب سے چھچلا پانی خلیج فارس کا ہے یعنی اوسطاً ۸۴ فٹ۔ بالٹک کا پانی اس سے دوچند گہرا ہے اور انگلش چینل (نہر انگلستان) اس سے بھی کچھ زیادہ یعنی اوسطاً ۱۹۲ فٹ۔ بحیرۂ شمالی (North Sea) البتہ نسبتاً گہرا ہے اور اس کی گہرائی کا اوسط ۳۱۲ فٹ ہے۔

جس طرح ہم کو زمین پر پہاڑ اور وادیاں وغیرہ نظر آتی ہیں، اسی طرح سمندر کے اندر بھی موجود ہیں بعض مقامات پر سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں پانی کے اوپر نکل آئی ہیں اور انھیں کا نام جزائر ہے، چنانچہ جزائر گلاپوگس (Galapagos) جو جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کی طرف پائے جاتے ہیں، اس سلسلۂ کوہ کی چوٹیاں ہیں جو آبنائے پناما سے جنوب مشرق کی طرف پانی کے اندر ہی اندر چلا گیا ہے۔

مغربی بحر پاسفک میں بکثرت جزایر پائے جاتے ہیں اور وہ سب کے سب سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں شمالی اٹلانٹک میں ایک سلسلۂ کوہ ۱۳۰۰ فٹ کی گہرائی میں اندر ہی اندر چلا گیا ہے جو اسکاٹ لینڈ کو آئس لینڈ سے ملاتا ہے۔ الغرض اسی طرح کے بہت سے سلسلے پہاڑوں کے پانی کے اندر پائے جاتے ہیں، شمالی اٹلانٹک میں سلسلۂ کوہستان بہ نسبت وسطِ اٹلانٹک کے کم پایا جاتا ہے، جہاں بعض پہاڑوں کا سلسلہ ۷۰۰۰ میل تک چلا گیا ہے۔

بحرِ ہند میں سماترا کے مغرب اور جاوا کے جنوب میں ایک متوازن سلسلہ پہاڑیوں اور وادیوں کا نہایت عجیب و غریب پایا جاتا ہے۔ پہلے ایک وادی مابین جزایر سماترا و نساوی پائی جاتی ہے جو ماورائے جاوا بارہ ہزار فٹ گہری ہے اور اسی کے متوازی ایک سلسلۂ کوہ چلا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر دوسری وادی بالکل متوازی ۱۲ ہزار فٹ کی ملتی ہے اور پھر ایک سلسلۂ کوہ اسی کے ساتھ ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔

سمندر کی سطح کبھی ساکن نہیں ہوتی اور اس کا پانی ہمیشہ مدوجزر میں رہتا ہے، اسی لئے اس کا درجۂ حرارت بھی ۲۴ گھنٹے میں ایک نہیں رہتا۔ دن میں ہوا کے ٹمپریچر کے مقابلہ میں اس کا ٹمپریچر ایک ڈگری زیادہ رہتا ہے اور رات کو ڈیڑھ ڈگری گرم۔

سمندر کا پانی اپنی حرارت بالکل سورج سے حاصل کرتا ہے گو تھوڑی مقدار حرارت کی اندرون زمین سے بھی اسے پہونچتی رہتی ہے۔ سورج کی کرنیں کس گہرائی تک اپنا کام کرتی ہیں اور وہ کس مقدار کی حرارت پانی میں پیدا کر سکتی ہیں، اس کا صحیح علم ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا، لیکن ایک بار تحقیق سے یہ ضرور معلوم ہوا تھا کہ ایک صاف روشن دن میں جبکہ ہوا نہ تھی، ۶۵ فٹ کی گہرائی میں بحر روم کا پانی بہ نسبت سطح کے $\frac{1}{4}$ ڈگری زیادہ گرم تھا۔

سطح آب سے لیکر بارہ ہزار فٹ کی گہرائی تک سمندروں کا ٹمپریچر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی گئی ہے، لیکن اس کے نتائج ایسے نہیں جن کی بنا پر کوئی کلیہ قایم ہو سکے۔ خطِ استوا پر واقع ہونے والا حصۂ آب اور خطِ استوا سے

اِدھر اُدھر بٹے ہوئے حصہ میں سورج کی گرمی کا اثر ضرور مختلف ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی کوئی یکسانیت نہیں ہوا اور مختلف موسموں میں اتنی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے کہ اس کی بنا پر کوئی اصول نہیں متعین کیا جا سکتا۔

گرمی کے زمانہ میں دنیا کا سب سے زیادہ گرم حصۂ آب خلیج فارس ہے جس کا ٹمپریچر اس زمانہ میں ۹۶ ڈگری رہتا ہے بحر احمر (Red Sea) بھی تقریباً اتنا ہی گرم رہتا ہے، یعنی ۹۴ ڈگری۔ خلیج بنگال اور اسی طرح خطِ استوا پر واقع ہونے والے بحر ہند کے اور حصوں میں بھی بارش سے پہلے درجۂ حرارت ۸۶ تک پہونچ جاتا ہے۔ جاپان کے شمالی مشرقی حصۂ آب کا ٹمپریچر بہت بدلتا رہتا ہے یعنی جب کم ہوتا ہے تو ۲۰ ڈگری تک گر جاتا ہے اور بڑھتا ہے تو ۸۲ تک پہونچ جاتا ہے، اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ وہاں زمین کے اندر سے کبھی گرم چشمے اُبلتے ہیں اور کبھی سرد۔

سمندروں کے ٹمپریچر پر مقدارِ نمک کا اثر ہوتا ہے، یعنی جس حصۂ آب میں جتنا زیادہ نمک پایا جائے گا اتنا ہی زیادہ سرد ہوگا۔

سمندر کا پانی خالص پانی نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سی اور چیزیں بھی ملی ہوئی ہیں۔ اسوقت تک دنیا میں ۹۰ عناصر دریافت ہوئے ہیں جن میں تیس سمندروں کے پانی میں ملتے ہیں، یہاں تک کہ سونا اور چاندی بھی پانی میں موجود ہے، لیکن اتنی کم مقدار میں کہ اس سے کوئی تجارتی فایدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ نمک اور نمک والے عناصر البتہ اس میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

بحر اٹلانٹک سب سے زیادہ نمکین سمندر ہے، اس کے بعد بحر ہند کا نمبر ہے۔ خطِ استوا پر واقع ہونے والے حصوں میں نمک زیادہ پایا جاتا ہے اور قطبین کے حصوں میں سب سے کم۔ خلیج فن لینڈ اور بوتھنیا کا پانی نسبتاً بہت صاف ہے۔

سمندروں کے پانی کا نمک نکال کر اس کو پینے کے قابل بنانا آسان ہے۔ اس کا طریقہ قدیم سیاحوں کو بھی معلوم تھا اور اب تو خیر یہ عام بات ہو گئی ہے۔

سمندر کے پانی کو گہرے نیلے رنگ کا کہتے ہیں جو بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن شاید حقیقت یہ نہیں ہے، آپ اگر بلندی سے اسکو دیکھیں تو چھچلا پانی سبز نظر آئے گا، جس کا سبب یہ ہے کہ اس میں ریت ملی رہتی ہے۔ گہرے حصوں میں بھی بعض جگہ رنگ سبز نظر آتا ہے، جس کا سبب ان بیشمار کیڑوں کا جھنڈ ہے، جو چھوٹی مچھلیوں کی غذا کے لئے قدرت نے سمندروں میں پیدا کئے ہیں۔ شمالی اٹلانٹک اور بحر ہند و بحر پاسفک کے منطقۂ معتدلہ میں پانی کا رنگ عام طور پر واقعی نیلا نظر آتا ہے، لیکن جتنا آپ قطب شمالی کی طرف بڑھتے جائیں گے، اتنا ہی زیادہ سبز ہوتا جائے گا یہاں تک کہ بحیرۂ شمالی کا پانی خالص سبز رنگ کا نظر آئے گا۔ بحر روم کا نیلگوں رنگ بہت مشہور ہے، لیکن صرف مشرقی حصہ کا

مغربی حصہ کا مائل بہ سبزی ہے۔ رنگ کا تعلق پانی کی صفائی سے بھی ہے۔ یعنی پانی جتنا زیادہ صاف ہوگا، اتنا ہی زیادہ نیلگوں نظر آئے گا۔ پانی کی صفائی دیکھنے کے لئے سفید رنگے ہوئے گول توے، اندر ڈالے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ نظر نہ آئیں۔ چنانچہ اس طریقہ سے سرگاسو (Sargasso) سمندر کا پانی بہت زیادہ شفاف معلوم ہوا ہے، کیونکہ سات فٹ قطر کا توا، ۱۶۲ فٹ کی گہرائی میں بھی وہاں صاف نظر آتا ہے، برخلاف اس کے بحرِ شمالی میں ۶۰ اور ۱۰۰ فٹ کے درمیان ہی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کے اندر کرنوں کے نفوذ کا بھی تجربہ کیا گیا ہے، چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ بحرِ روم میں بارہ ہزار فٹ تک روشنی کا اثر پایا جاتا ہے، لیکن جب ڈاکٹر بیب (Beebe) نے ایک خاص آلہ کے ذریعہ سے، ساحلِ برموڈا کے قریب تک پہونچنے کی کوشش کی تھی، تو دو ہزار فٹ کے بعد انکو سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

لہروں کی پوری ضخامت و قوت کا اندازہ بھی کھلے ہوئے سمندروں ہی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی بڑی سی بڑی جھیل ایسی نہیں ہے جہاں لہریں اپنی قوت کے ساتھ اُٹھ سکیں۔ بحرِ اٹلانٹک، بحرِ ہند اور بحرِ پاسفک میں چونکہ ہوا بہت زور سے چلتی ہے اس لئے وہاں موجوں کو پوری قوت کے ساتھ اُٹھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ مشہور ہے کہ سمندر کی لہر پہاڑ کی طرح اُٹھتی ہے اور وہ واقعی ایسی ہی معلوم بھی ہوتی ہے، کیونکہ جب مسلسل اونچی اونچی لہریں اُٹھتی ہیں اور پانی کے تھپیڑوں سے جو چھینٹے اُڑ اُڑ کر آتے ہیں ان کے اندر سے سامنے کی فضا دھندلی ہو جاتی ہے اور لہروں کی بلندی پہاڑ ہی کی طرح نظر آتی ہے طوفان کے وقت لہروں کی بلندی پہاڑ ہی کی طرح نظر آتی ہے طوفان کے وقت لہروں کی بلندی عموماً چالیس پچاس فٹ ہوتی، گو کبھی کبھی طوفانی حالت میں وہ ستر فٹ تک پہونچ جاتی ہے ورنہ یوں سکون کی حالت میں اس کی بلندی ۲۰ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اگر ہوا کا رُخ بھی وہی ہو جو سمندر کے ہیجان کا ہے اور اس کی رفتار زیادہ ہو تو لہروں کا تسلسل بہت بڑھ جاتا ہے۔ لہروں کی قوت ڈھلواں ساحلوں پر بہت بڑھ جاتی ہے۔ بحرِ اٹلانٹک اور بحرِ شمالی میں لہروں کا دباؤ فی مربع فٹ ۳ ½ ٹن دریافت کیا گیا ہے، حالانکہ سڑک کوٹنے والے رولر کا دباؤ فی مربع فٹ ایک ٹن کے قریب ہوتا ہے۔

سمندر کی تباہ کاریاں تو ظاہر ہی ہیں، لیکن اس کا ایک تعمیری پہلو بھی ہے۔ ۳۵ سال کے عرصہ میں برطانیہ کی ۴۶۷۰ ایکڑ زمین اگر دریا برد ہوئی تو ۴۸ ہزار ایکڑ زمین دوسری جگہ سمندر نے دے بھی دی۔

سمندر کے اندر جتنی دولتیں پنہاں ہیں ان کا اندازہ مشکل ہے، لیکن سب سے بڑی دولت اس کا مگنیشیم ہے۔ یہ ایک چمکدار دھات ہے جس کی چادریں، سلاخیں اور ستون وغیرہ بن سکتے ہیں، اور نئی دنیا سے یہ اُمیدیں

قایم کی ہیں کہ آیندہ تمام مکانوں کی تعمیر اسی دھات سے ہوگی اور کرۂ زمین ان تعمیروں سے جگ مگ جگ مگ کرنے لگے گی۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ جو اشیاء سمندر میں پائی جاتی ہیں ان کے ۱/۲۵ حصہ سے ۶۰ لاکھ ٹن مگنیشیم، گیارہ کرور ستر لاکھ ٹن نمک، ۹ کرور ۴۰ لاکھ ٹن چاندی، ۳۰۰ لاکھ ٹن سونا حاصل ہو سکتا ہے۔ مونگا بھی سمندر کی بڑی دولت ہے جسکا علم عہد قدیم کے انسان کو تھا، اور موتی کی قدر و قیمت تو خیر سبھی کو معلوم ہے۔

بعض چھوٹے چھوٹے سمندر ایسے ہیں جن کے چاروں طرف خشکی کا حصہ ہوتا ہے اور اصطلاح میں ان کا نام بحر محاط (Inland Sea) ہے۔ اس قسم کے سمندروں میں سب سے بڑا بحر اخزر (Caspian Sea) ہے، جس کا رقبہ ایک لاکھ ستر ہزار مربع میل ہے۔ ان کو ہم ایک لحاظ سے جھیل بھی کہہ سکتے ہیں، یہ جھیلیں پہاڑوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایورسٹ کی چوٹی پر بھی ایک جھیل ہوائی جہاز سے دیکھی گئی ہے، لیکن وہاں تک کوئی پہونچ نہیں سکا۔ یہ جھیل بہت چھوٹی ہے، مگر بڑی جھیلوں میں سب سے اونچی جھیل ٹٹی کاکا ہے جو جنوبی امریکہ کے پہاڑ میں سطح آب سے ۱۲۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ بعض جھیلیں ایسی ہیں جو سطح آب سے بہت نیچے واقع ہیں۔ ان میں بحر مردہ (Dead Sea) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے یہ سمندر کی سطح سے ۱۲۹۲ فٹ نیچے واقع ہے۔

گہری جھیلوں میں سب سے زیادہ مشہور سائیبریا کی بیکال جھیل ہے جس کی گہرائی کا اوسط ۲۳۰۰ فٹ ہے لیکن بعض جگہ اس کی گہرائی اس سے دوچند ہے۔ افریقہ کی جھیل ٹنگانیکا دنیا کی سب سے لمبی جھیل ہے جو ۴۵۰ میل تک چلی گئی ہے اور گہری بھی بہت ہے یعنی بعض مقامات پر اس کی گہرائی ۴۰۰۰ فٹ ہے۔

یوروپ کی سب سے بڑی جھیل لڈوگا ہے جو روس اور فن لینڈ کے درمیان سرحد پر واقع ہے اس کا رقبہ سات ہزار مربع میل ہے، لیکن گہرائی بہت کم ہے یعنی صرف ۳۰۰ فٹ۔

سب سے بڑا دریا دنیا کا وہ ہے جو مسوری (Missouri) اور مسی سپی (Mississipi) سے ملکر بنتا ہے۔ یہ امریکہ میں واقع ہے اور اس کی لمبائی چار ہزار دو سو میل ہے۔

اس دریا سے ۱۲۵۰۰۰۰ مربع میل زمین میں آبپاشی ہوتی ہے جو امریکہ کا ایک تہائی حصہ ہے۔ دریائے امیزن بھی چار ہزار میل کا لمبا دریا ہے اور اس سے ۲۷۲۲۰۰۰ مربع میل زمین سیراب ہوتی ہے یہ دریا اتنا چوڑا ہے کہ ۲۳۰۰ میل تک اس میں بڑے بڑے جہاز چلے جاتے ہیں اور ۵۰۰۰ میل تک چھوٹے جہاز۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۲۰ فٹ ہے۔ بارش کے زمانہ میں اس کا پاٹ کہیں کہیں ۵۰ میل کا ہو جاتا ہے۔ اس کا دہانہ ۲۰۰ میل چوڑا ہے۔

دریائے نیل بھی دنیا کا نہایت مشہور دریا ہے۔ یہ ۴۰۵۰ میل لمبا ہے، لیکن رقبۂ آبپاشی بہت کم ہے۔

بعض دریا ایسے بھی ہیں جو اپنا راستہ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً مسی سپی، یا شمالی چین کا ییلو (Yellow River)

بعض ایسے دریا بھی ہیں، جو سمندر میں نہیں گرتے۔ ان میں وسطِ ایشیا کا دریائے طارم بہت مشہور ہے۔

دنیا کی سب سے اونچی آبشار امریکہ کی ونی زولا ہے۔ یہ ایک میل کی بلندی سے گرتی ہے اور اتنا شور پیدا کرتی ہے گویا ہزاروں گھنٹے بجائے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں آبشار جوگ جو (Western Ghats) میں واقع ہے ۸۲۰ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے۔ برٹش گائنا کی ایک آبشار ۸۲۲ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے اور ۷۴۱ فٹ تک تو بالکل عمودی شکل میں گرتی ہے۔

چوڑی آبشاروں میں امریکہ کی نیاگرا بہت مشہور ہے جس کی چوڑائی چار ہزار فٹ ہے، اس کے بعد افریقہ کی کی آبشار وکٹوریا ہے۔

ل۔ احمد صاحب کے افسانے

انشائے لطیف:۔ اُردو ادب میں صاحب "لالہ رخ" کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اُردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے یہ چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہے اور ادب و شعریت کا ذوق ہے تو اس مجموعے کو دیکھئے، پونے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد دو روپیہ۔

نغمات:۔ اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساتھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں، جسے نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اُردو کی لطافت و نفاست کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا ازبس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل:۔ ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے جس میں معاشری خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا فسانہ:۔ یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے مسرت ازدواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری و اخلاقی مسایل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

بڑا گھر

سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ باپ، چچا، بھائی اور سب رشتہ دار رو رہے تھے، کیونکہ آج بالیش کی رخصتی ہو رہی تھی مگر سب کے دلوں میں تسلی سی تھی، کیونکہ اُن کو یقین تھا کہ اپنے خاوند کے گھر جا کر اس کو ضرور سکھ ملے گا جو اس کو اپنے باپ کے گھر میں نہ مل سکا تھا۔ ماں نہ ہونے سے کسی کو بہت کم سکھ مل سکتا ہے۔ سب بالیش کو گھیرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو لیکن دلوں میں خوشی لے کر بالیش سے مل رہے تھے۔ مگر بالیش، ان سبھوں سے آنکھوں میں آنسو ہی لئے ہوئے مل رہی تھی۔ اُس نے اپنے دل میں خوشی کو ٹٹولا۔ تو اس کا نام و نشان کہیں نہیں ملا۔ آنے والے زمانہ میں بھی دور تک اُس کی نظر گئی۔ مگر وہاں بھی اس کی خوشی کا پتہ نہ چلا۔

بہت دنوں سے بالیش اور روپ ایک ہی مقام کی طرف منزلیں طے کرتے چلے آ رہے تھے جہاں وہ دونوں ایک ہو جاویں گے۔ آخر کو دونوں نے پہلی منزل پار بھی کر لی تھی اور اس مقام کا نظارہ بھی وہ کرنے لگے تھے۔ ہماری زندگی میں پہلی منزل ہوتی ہی ایسی ہے کہ جب ہم کسی سے قول قرار کرتے ہیں تو اس کو پورا کرنے کا ارادہ ہمارے دلوں میں ایسا سما جاتا ہے، جیسے کہ بیل کی جڑ زمین میں۔ اور یہی محبت کی پہلی منزل ہے۔ اس منزل کو پار کر کے دونوں کبھی پیچھے لوٹنے کا خیال نہیں کرتے چاہے آگے کتنی تباہیوں کے منظر ہوں۔ بلکہ تباہیوں کے منظر تو ان کو اور آگے بڑھنے پر آمادہ کر دیتے ہیں تاکہ اگر ان کے ایک ہو جانے کا مقام ان کی پہونچ سے باہر ہو تو وہ بھی ان تباہیوں میں فنا ہو جاویں یہ پہلی منزل ان دونوں نے پار کر لی تھی۔

ان دونوں کی نظروں کے سامنے پہلی منزل کے آگے کوئی مشکل نظر نہ آ رہی تھی! ایک دوسرے کا مل جانا دونوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جنت مل گئی۔ روپ دولتمند نہ تھا۔ مگر فقیر بھی نہ تھا۔ اس کے پاس جائداد بھی تھی اور دو سو روپیہ کا نوکر بھی تھا۔ مگر وہ اتنا دولتمند نہ تھا جتنا اُس کے چچا اور اُس کے باپ چاہتے تھے۔ مگر بالیش کو تو یہ دیکھنا تھا کہ اُسکے ارمان روپ پورے کر سکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دولت!۔ دولت نہ سہی، روپ کے پاس محبت کا تو ذخیرہ تھا۔ بالیش اپنے دل میں محبت چھپائے بیٹھی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد محبت مشکل سے ہی ملتی ہے اور بالیش محبت چاہتی تھی۔ دولت نہیں۔ اس لئے ان دونوں کے ملنے میں مشکلیں کیونکر حائل ہو سکتی تھیں۔ مگر اُس کے والدین

کی خواہش کو کیا کیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کی شادی کسی بڑے گھر میں ہو اور ان کے ساتھ ساتھ دنیا کی رکاوٹوں کو کیسے پار کیا جاوے!

دنیا ایک دوسرے کو مشکل سے سکھی دیکھ سکتی ہے۔ دونوں کو پہلی منزل سے پار ہوتے دیکھ کر دنیا والے آنکھ پھاڑتے ہوئے بالیش کے پتا کے پاس آئے اور بولے "ارے یہ کیا کیا۔ تمھاری سمجھ کہاں چلی گئی۔ اپنی لڑکی کو کہاں جھونکنے کا ارادہ کر لیا ہے"۔ ان طعنوں کے آگے ایک انسان کہاں تک کھڑا رہ سکتا ہے! بالیش کے پتا کو ان طعنوں کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا۔ بالیش کے کانوں میں بھی ان باتوں کی بھنک پڑی اور روپ کے ساتھ اس کی شادی نہ ہو سکی۔

بالیش نے اپنے خاوند کے ساتھ بڑے گھر میں قدم رکھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ایک سنسان جنگل میں ڈال دیا ہے جہاں اس کو کوئی پھول نظر نہیں آتا۔ اپنے دل کے پھول کو۔ ٹوٹے ہوئے۔ مرجھائے ہوئے پھول کی پنکھڑی کو۔ وہ راستے میں بکھیرتی چلی آ رہی تھی اور یہاں پہونچی تو اس کے دل میں جھک کا پتہ نہ تھا۔ بادِ خزاں آئی اور باغ کو اُجاڑ کر گئی۔

بڑا گھر۔ ہاں بالیش نے دیکھا کہ گھر تو لمبائی چوڑائی میں بہت بڑا ہے۔ تین منزلہ مکان آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ صحن اتنا بڑا کہ ہزاروں آدمی اُس میں بیٹھ سکتے ہیں! کمرے بھی کافی بڑے تھے اتنے بڑے کہ ان میں بالیش کی نظر بھی کھو جاتی تھی۔ غرض یہ کہ گھر تو واقعی بہت بڑا تھا۔!!

بڑے گھر کی سی کیفیتیں بھی بالیش کو ملیں

اس کے کانوں میں قہقہوں کی آواز بھی آتی تھی اور ان قہقہوں سے بلند ایک سریلی آواز بالیش کے سینے کو چیرتی پھاڑتی نکل جاتی تھی! ایسا تو بڑے گھروں کا قاعدہ ہی ہے نہیں تو بڑا گھر کیسے معلوم ہو!

"ساری بہت اچھی ہے" بالیش کہتی

"مگر آج کیسے خریدی جا سکتی ہے؟ دوستوں نے مجھے پارٹی پر مجبور کر لیا ہے اُس میں بھی تو روپیہ خرچ ہوگا پارٹی کے لئے روپیہ نہیں۔ مگر پارٹی نہ کریں تو ناک جو کٹ جاوے گی۔ بڑا گھر پھر کیسے رہے گا۔ دولت کو دونوں ہاتھوں سے صرف کرنا یہی تو بڑے گھر کی نشانی ہے۔ پارٹی کے لئے تو۔ روپیہ کہیں سے لانا ہی پڑے گا۔۔۔ ساری کے لئے نہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی اچھی ہو!

"گھر میں بارہ بجے کیوں آئے"

"ارے راستہ میں دوست روک لیا کریں تو کیا اُن سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ آیا کروں ۔۔۔۔۔۔ اور

"ایسا قاعدہ ہمارے گھر کا نہیں ہے۔ بڑے گھروں کے قاعدوں سے چلنا ہوگا۔ ہمارے گھر کو نہ ڈبو!! اسکی ساس کہتی

"ارے آج پیالے کس نے توڑ دئے" اور بالیش کی طرف نگاہ کر کے کہنے لگی - "یہی ہوگی" پیالہ بالیش کے سامنے آکر گرا اور ایک ٹکڑا بالیش کے ماتھے سے لگا!

"پیالے روزانہ ٹوٹیں گے تو کہاں سے آویں گے"

"آج ہی تو پیالہ ٹوٹا ہے" اس کے بعد دو آنسو ٹپ ٹپ زمین پر گر گئے۔

"بس چپ رہ! میرے اوپر شیر ہو کر چڑھتی ہے! آج تک تیرے سسر بھی میرے اوپر شیر ہو کر نہ چڑھے! یہ بڑے گھر کی بہوؤں کا کام نہیں کہ پلٹ کر جواب دیں"!

"ہاں بڑے گھر میں اتنے نوکر ہوتے ہیں وہ بھی تو جواب اُلٹ کر نہیں دیتے"۔

بالیش کا سینہ چیرتی ہوئیں یہ آوازیں نکل جاتیں اور وہ سرد آہیں بھر کر رہ جاتی - ان سرد آہوں کا خیال اُسکے پتا نے کبھی نہیں کیا تھا - اتنا بڑا گھر ہے جہاں دولت کی بوچھار ہوگی - اتنے آدمی ہیں - لڑکی کے لئے ان کو سکھ ہی سکھ نظر آرہا تھا - مگر بالیش کا دل جانتا تھا کہ کتنا سکھ اُس کے پاس ہے -

ایک لق و دق میدان جس میں ایک تھکے مسافر کی نگاہ کھو جاتی ہے - ایسا ہی وہ بڑا گھر تھا آدمیوں کی بھی اُس میں بھیڑ تھی - مگر وہ اپنے کمرہ میں اپنے آپ کو اتنا اکیلا محسوس نہ کرتی جتنا وہ اس بھیڑ میں محسوس کرتی! دیکھنے کو تو وہ گھر کھچا کھچ نوکروں، رشتہ داروں سے ہر وقت بھرا رہتا تھا - مگر بالیش کے لئے وہ ایک ریگستان سے بھی زیادہ سنسان تھا اس گھر میں خلوص و محبت کا تو گزر تھا ہی نہیں، ہمدردی تو کوئی جانتا ہی نہ تھا! نوکروں کا قافلہ ادھر سے اُدھر حکم بجاتا ہوا نکل جاتا تھا - بالیش کو بھی اپنی ساس کا حکم بجالاتے سارا دن نکل جاتا تھا - حکم بجالانے میں پیار و محبت کہاں بالیش گم رہا کرتی! کچھ تکلیف ہوتی تو شکوہ شکایت کی بجائے دو آنسو آنکھوں سے ٹپکا دیتی - روتا دیکھ کر اس کی ساس اُس سے کہتی "کیسی مکار ہے آنسوؤں سے کام لینا چاہتی ہے!" نہ تو بالیش کو روتے ہی بنتا تھا نہ ہنستے ہی! اگر کبھی اکیلی کسی کونہ میں بیٹھنے کا موقع مل جاتا تو بیشک وہ دل کھول کر رو لیا کرتی -

اگر دل ایک ہی طرف جما ہو تو تکلیف تکلیف محسوس نہیں ہوتی! اگر ایک بہو کو ایک ہی گھر کا خیال ہو تو وہ یہ سوچ لیتی ہے کہ یہی میرا گھر ہے - چاہے دوزخ ہو چاہے جنت - اس میں کسی نہ کسی طرح سے اپنی زندگی گزارنی ہے ایسی حالت میں تکلیف بھی سہی جا سکتی ہے مگر جب تکلیف دیکھ کر اس کا دل کسی اور کا خیال کھینچ لاتا ہو تو تکلیف میں دونا دکھ معلوم ہوتا ہے! رات دن بالیش کو یہ خیال ستاتا کہ اگر وہ وہاں جاتی تو ایسا کیوں دیکھنا پڑتا - بالیش نے کبھی سوچا تھا "میں روپ سے سب حال کہہ دیا کروں گی - ارے - وہ تو پہلے ہی میرا سب حال جانتے ہیں" اُس کے منہ پر شرم کی لال جھلک دوڑ آتی! کبھی اُس نے انگلیوں پر مہینے شمار کئے تھے ہفتے شمار کئے تھے - دن گنے تھے کبھی وہ یہ خیال کر کے اُچھل پڑتی تھی کہ اب تو روپ سے ملنے کے تھوڑے ہی دن باقی ہیں - دن ہی کہاں ہیں - آ ہی گئے"۔

کبھی اُس نے یہ نہ جانا تھا کہ روپ بھی اُسے اتنا ہی چاہتا ہے جتنا وہ اسے ! " اوہ میری دلی مراد بن مانگے ہی ملی ! "
وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑتی تھی ! مگر کیا معلوم تھا کہ اس کی خوشی کبھی تکمیل تک نہ پہونچے گی اور دنیا میں ایسے بہت سے آدمی ہیں جو دوسروں کی خوشی سے حسد بھی کرتے ہیں۔ جب ٹیکے کی رسم ہوئی تو اس نے سوچا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اب ہمیں کون ایک دوسرے سے جدا کر سکتا ہے۔ مگر لڑکیوں کو اپنے اوپر حق تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ خواہش پیدا ہوتی ہے انکے دلوں میں اور پورا کرنے نہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے دوسروں کو۔ ان کو آنکھیں بند کرکے۔ ہونٹ دبا کر۔ بے زبان گائے کی طرح جس کے ساتھ باندھ دیا جاوے۔ چلا جانا چاہئے۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ اور وہ بالکل تنہا تھی ! غمگین انسان اپنے آپ کو تنہائی میں بھول جاتا ہے۔ بالیش نے بھی اپنے آپ کو کہیں کھو دیا تھا۔ اس کا خاوند اندر آیا۔ ٹیڑھی نگاہوں سے اس نے بالیش کی طرف دیکھا اس کے ماتھے پر جھریاں پڑ گئیں۔

" بالیش ! " اس نے پکارا

بالیش نے آواز نہیں سنی۔ اس کے سامنے تو پیالہ چھلکنے کا منظر تھا۔

" بالیش، یہاں تو آ "

" آخر بات کیا ہے " اُس نے ہاتھ پکڑ کر اُٹھانا چاہا۔ بالیش چونک پڑی !

" مجھے یہیں بیٹھا رہنے دو "

" آخر تو رات بھر کیوں رویا کرتی ہے "

بالیش چپ تھی۔

" میں جو ڈرتا تھا۔ وہی ہوا۔ میں پہلے سے جانتا تھا کہ تمھاری سگائی دوسری جگہ ہو گئی تھی ! "

تھوڑی دیر سناٹا اور پھر گہری سانس اور پھر —— !

" ہاں " بالیش کے منھ سے نکل پڑا۔

" ماں ناراض ہو رہی ہیں "

" نہیں آؤں گی "

کمرہ میں اندھیرا ہو گیا —— اُس کے بعد وہی ہوا جو تمام بڑے گھروں میں غریب بہو کے ساتھ ہوا کرتا ہے وہی تاریک رات ! چاروں طرف اندھیرا۔ مگر اندھیری گلیوں کو پار کرتی ہوئی بالیش کہاں جا رہی تھی !

دوسرے دن - بالیش کے پتا کھانا کھا رہے تھے۔ تھالی چھوڑ کر ایک دم کھڑے ہو گئے۔

" ہائیں، بالیش تو یہاں کہاں ! "

بالیش کے منہ میں زبان ہو تو بولے!

"نہ سر پر چادر، نہ پاؤں میں جوتا! یہ کیا ہے! بول تو سہی"

بالیش اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔

"اور یہ تیرے منہ پر لال لال نشان کیسے ہیں۔ یہ تیرا منہ کس نے نوچ ڈالا ہے" بالیش کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"انھیں نے" اس سے آگے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ رو پڑی اور اپنے کمرہ میں کھاٹ پر جا گری۔ پتا دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے آئے۔ پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ بالیش چلا اُٹھی۔

"پیٹھ میں کیا ہوا"

دیکھا تو وہاں نیل پڑے تھے!

پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس کے چچا۔ بھائی۔ پتا اور محلہ کے پڑوسی سب بالیش کے چاروں طرف تھے! ابھی انھوں نے گلے لگا کر بالیش کو رخصت کیا تھا اور اشیرباد دیا تھا کہ سدا خوش رہے! اُس وقت ان کے دلوں میں تسلی تھی کیونکہ بالیش بڑے گھر جا رہی تھی۔ لیکن اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ بڑے گھر کے لئے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

بالیش چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور سب چاروں طرف خاموش کھڑے تھے۔

شنکر سروپ بھٹناگر

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۱ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔ اکتوبر ۵ر۔ (سنہ ۳۶ء) جنوری ۸ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) جنوری ۸ر۔ مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۸ء) پورا فائل صہ ر۔

منیجر نگار لکھنؤ

مخدوم کی شاعری

جب کسی قوم کی حالت تباہی اور بربادی کے عبرت انگیز انجام کو پہونچ جاتی ہے پستی اور تنزل کے احساسات اسکا مقدر بن جاتے ہیں۔ اس وقت نظام طبعی کو برقرار رکھنے کے لئے زمانہ کروٹیں بدلتا ہوا ایسے ایسے پیغمبران سخن اُٹھاتا ہے جن کا پیام احساسات کو جگاتا اور ذہنی انقلاب برپا کرتا ہے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آیندہ بھی یونہی رہے گا۔

ادب جدید کے پیغمبر میکسم گورکی نے ادب کے دھارے کو انسان کی بے چارگی اور زندگی کی نوحہ خوانیوں سے روک کر یہ کہنے کے لئے مجبور کیا کہ "زندگی ابدالآباد تک رہے گی ہم اس کے کارساز حقیقی ہیں قیامت یہی ہو گی کہ روح الاجتماع داور محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لئے جہنم رسید کر دے"۔ گورکی سماج اور انسانیت کی تباہ کاریوں سے نفرت کرتا ہوا ایک پیام دے گیا کہ ستم رسیدہ انسانیت۔ انسانیت کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ اور ایسی تمام پابندیوں کو فنا کر دیا جائے۔ اور ایسا نظام بنایا جائے جو انسانیت کے مقاصد کی ترجمانی کرے نہ صرف ترجمانی بلکہ اپنے جہد عمل کے لئے راہیں بھی تلاش کرے۔ اس کا یہ پیام زمانہ کے معاشرتی حالات سیاسی عقائد اور اخلاقی رجحانات کا آئینہ دار تھا اسی لئے، اس کے پیام میں زندگی ہے۔ اس کے تاثرات میں نہ صرف اس کا وطن بلکہ ساری دنیا بھی گردشیں لگا رہی ہے اس پیام کو سمجھنے والوں نے تنزلِ وانحطاط کو فنا کی گود میں سلانے کے لئے انقلاب کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا۔ احساسات کی ان بیداریوں نے ہندوستان میں قاضی نذرالاسلام کو پیدا کیا جو برائیوں کے اندھیرے۔ خوفناک اندھکار اور آتشکدہ استبداد کے جہنم کو سرد کرنے کے لئے آہنی عزم سے میدان میں چلے آئے۔ قاضی کی آتشیں گیتوں نے ادب کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ ملک کے سنجیدہ ادیبوں اور شاعروں نے قاضی کے دبستاں میں اپنے لئے جگہ کر لی اور اپنی استعداد سے جدید ادب کو عبارت بنایا۔ مخدوم بھی ان کے مقلدین میں سے ایک ہیں اور اپنے لئے ایک رفیع مقام رکھتے ہیں۔

مخدوم حیدرآباد کے باشندے اور جامعہ عثمانیہ کے ایم۔ اے ہیں اور جدید ادب کے علم برداروں میں یا ترقی پسند شعرا میں حیدرآباد کی واحد نمایندگی کر رہے ہیں ان کی شاعری کا آغاز سنہ ۱۹۳۲ء سے ہوا جبکہ یہ بی۔ اے میں تھے۔ کالج کی آزاد اور رنگین زندگی میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ ادیب یا شاعر

جو کچھ لکھتا ہے وہ زمانہ کے رجحان سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ مخدوم پر بھی یہی بنی۔ مزاحیہ نظموں اور رومانی شاعری سے اس عرصہ میں مشق ہوتی رہی۔ "پیلا دوشالہ" مخدوم کی پہلی شاہکار طنزیہ نظم ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ادبی لطافتوں سے مملو یہ ایک بہترین طنزیہ نظم ہے اور ادب میں اپنے لئے ایک رفیع مقام رکھتی ہے۔ اس کے بعد مخدوم رومانی شاعری کے میدان میں گھومتے رہے۔ مخدوم بہت کم کہنے والوں میں سے ایک ہیں اور اُسی وقت کہتے ہیں جبکہ زندگی ان سے تقاضا کرتی ہے اور حیات انھیں اکساتی ہے۔ وہ اُسی وقت کہتے ہیں جب کہنے کے عالم میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری میں ایک خاص اثر اور خاص جوش ہے ان کے رومان کا آغاز کھیتوں میں پانی کے کنارے ہوتا ہے۔ یہیں اظہارِ حرفِ مدعا کی جراُت کرتے ہیں۔ سرور سرمدی سے معمور زندگی میں مئے دو آتشہ کے مزے لیتے ہوئے خلوتِ معصوم کو رشکِ طور بناتے ہیں۔ وہ اسی پریم سنسار میں

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں ۔۔۔ تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اُس کو وہ نہا جاتا پسینے میں ۔۔۔ مے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے، یاد ہے اب بھی

شاعر کو رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگین سحاب جب آتا دیکھتے تو کہدیتے کہ:-

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جام شراب آتا
وہ کیا آتا رنگیلی راگنی رنگیں سحاب آتا
لبوں کی مئے پلانے جھومتا مستِ شباب آتا

جب وہ آتا اور حیا کے بوجھ سے سرِ قدم پر لغزشیں ہوتیں تو فضا میں اس رنگین بدن کی لرزشیں منتشر ہو جاتیں جس سے شاعر کے رباب دل کے تاروں میں مسلسل جنبشوں کا آغاز ہو جاتا۔ مخدوم اسی پریم سنسار میں کبھی کسی کے انتظار میں وہ گداز بھری تانیں الاپتے ہیں کہ سارا ماحول بھی انتظار میں محو ایک بے کلی سی محسوس کرتا ہے۔ جاگے ہوئے تارے بھی نیند کی مستی میں غرق ہو جاتے ہیں لیکن مخدوم چشم براہ اور نقشِ حیرت بنے ہوئے گداز کے عالم میں کہدیتے ہیں کہ:-

صبح نے سیج سے اُٹھتے ہوئے انگڑائی لی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب مری نیند اُڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
اب بھی آجا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
تیرے قدموں پہ مری جان مری جاں نکلے

ان کی اس رومانی شاعری میں مینے ایسا محسوس کیا ہے کہ ہر شخص کے دل کی دھڑکنیں پنہاں ہیں۔

کالج کی زندگی بھر یہ اسی ماحول میں رہے۔ کالج کے آخری ایام میں جب مستقبل سے قریب ہو رہے تھے اور جدید ادب انھیں متاثر کر رہا تھا ان کے تصورِ حیات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی انسانیت کا اندرونی اضطراب مسلسل غلامی ذہنی بربادی بھوک، غریبی، بے روزگاری، ظلم و استبداد زندگی کی قدامت اور پچھڑا ہوا پن یہ سب اپنی بپتا سنانے لگے۔ سارے ہندوستان میں ہر طرف یہی بربادیاں نظر آنے لگیں۔ مخدوم نے دیکھا کہ ان کا وطن جہل، فاقہ، بھیک، بیماری اور نجاست کا مکان ہے۔ عقل و فراست کا مسان ہے جو روانیوں کا غلام ہے اور جس میں صدیوں کا جذام پرورش پا رہا ہے۔ مخدوم کی بصیرت نے دیکھا کہ ایک بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی نعش ہے ایک خون میں لتھڑا ہوا لقمہ ہے۔

ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک بھٹکی روح ہے جس کا مکان کوئی نہیں۔ یہاں ایک ایسی مسلسل رات ہے جس کی صبح ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ

اس زمین موت پر ور در کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

وہ اس دنیا کو ڈھا دینا چاہتے ہیں وہ یہاں کی فرسودہ زندگی کے نظام سے باغی ہو جاتے ہیں۔ ان کا وطن جس کی بے کاریوں سے وہ کبھی نہیں تھکے وہی وطن جہاں کبھی

عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روح جہاں بانی تھی

ہاں اسی جگہ مخدوم کے دل زار نے یہ دیکھا کہ :-

خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

یہ وہ بدنصیب واقعہ تھا جس نے مخدوم کو للکار کر کہا کہ وہ اس نظام کی دھجیاں اُڑا دے اصلاح مرض کا صحیح علاج نہیں بلکہ انقلابی درد کا صحیح درمان ہے۔

مخدوم نے محسوس کر لیا کہ ظلمت کفر کو ایمان۔ سگ خونخوار کو انسان اور دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہا جا سکتا وہ کہہ اُٹھے کہ

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا،
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
حورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا

اب یہ کھیل نہیں ہو سکیں گے چونکہ یہ بہت کھیلے جا چکے وہ انقلابی اپنا مدعا بنا لیتے ہیں کہ :-

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

مخدوم ایسے سماج کے فرد ہیں جو نزع کے عالم میں ہے۔ جس کے مکین۔ مہاجن۔ امیر۔ کاشی کے برہمن اور کعبہ کے فقیر ہیں۔ جن کے ناخن کی خلش سے اقوام عالم واقف ہیں۔ انگلی رکھنے کا کیا ذکر — یہی خندہ و تبسم ہیں ان کی حویلیاں

رہزنوں کا قصر شوری قاتلوں کی خوابگاہ
کھلکھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ ،

انھیں حویلیوں میں روز و شب انسانیت کو نیلام ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور بے نان و بے پوشش گداؤں کا ایسا گروہ نظر میں آتا ہے :-

جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

ان کی خانماں برباد اور المناک زندگی سے شاعر کو یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ ان کے

کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوس ریں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اس بربادی پر وہ کڑھ کر نہیں رہ جاتے۔ وہ انقلابی ہیں۔ وہ ایمان کے قایل نہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ بنی نوع انسان کے ہر مسئلہ کو تاریخ نے استبداد سے طے کرایا ہے اس لئے ان کی حیات کا مدعا یہ ہے کہ

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

وہ کاسۂ دہر کو معمور کرم کرکے اور قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر کے ختم ہونا نہیں چاہتے وہ رجائی ہیں تباہیوں اور بربادیوں میں بھی مسکراتے ہیں۔ ثبات قدمی سے دلیرانہ میدان میں آکر اپنا مدعا سناتے ہیں کہ

دور ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روح انسان کو آزاد کیا جائے گا

وہ اس نئی دنیا اور نئے آدم کے لئے اور ان کھنڈروں پر آزادی کے پرچم کھولنے کے لئے علمبرداران آزادی یعنی ہندی نوجوانوں سے عقیدت رکھتے ہیں۔ چونکہ انہی کی نظر اور ذوق یقین سے زنداں کی زنجیریں کٹ جائینگی۔

ان کا نوجوان آندھیوں میں پلا اور طوفانوں میں پروان چڑھا - وہ مرد مجاہد ہے اس کی ٹھوکر سے گیتی لرزہ براندام ہوتی ہے ان کا نوجوان اس سارے فرسودہ نظام کی دھجیاں اُڑا دے گا اور ناپاکیوں کا جنازہ نکال دے گا۔

مخدوم نشاۃ ثانیہ کے لئے سرمایہ داری کو ام الخبائث اور گرسنگی کو ایک بدترین لعنت سمجھتے ہیں وہ غداران وطن اور ان کی نعشوں کے جہنم کو سرد کرنے کے لئے قیامت کا جوش لئے ہوئے آتے ہیں:-

خدا نے فرشتوں کے نام کہیں فرمان دیا ہے کہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

داور محشر اس کھیت کے خوشۂ گندم ہی کو جلائے گا۔ حکم کیوں دیتا ہے کہ کھیت کے اس مالک کو فنا کر دیا جائے جس نے دہقان کو روزی میسر ہونے نہیں دی۔ شاید وہ اپنی شیریں سخنی سے ایک دور دراز عرصہ تک ہمیں فریب دیتا رہے گا لیکن اب ہمارا فریب کھانا مشکل ہے۔ دُنیا کی عمر کافی دراز ہو چکی۔ ہمارے تجربے پختہ ہو چکے اور سچ پوچھئے تو اب جبر و استبداد کی انتہا ہو چکی۔ اب یہ وعدہ اور سارے فرمان طاقِ نسیاں ہو جائینگے۔ اب یہ جہاں

قصر شداد کے دربند ہیں بھوکوں کے لئے

وہیں — اسی دنیا میں احساسات کی بیداریاں جہد و عمل کے لئے آئیں گی اور کہیں گی کہ

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

اب نہ بانس رہے گا کہ بنسیا بجے گی — استبداد کا وہ دیوتا خوشۂ گندم کے ساتھ فنا ہو جائے گا اور نئی دنیا اور نئے آدم پیدا ہوں گے جو دنیا کو حیات افروز حالت میں رکھیں گے۔

مخدوم اس بربادی اور فنائیت میں اس نظام کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں زلزلوں، آندھیوں، گرجدار گھٹاؤں اور جہنم کی ہواؤں کے شورِ محشر سے مدد لیکر سرمایہ اور استبداد کے ناپاک جنازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ یہ پھر کبھی نہ اُبھر سکے ان کا انقلاب ایک قیامت صغرا کا نمونہ ہوگا۔ جس کا نتیجہ کائنات کے لئے ایک متوازن نظام ہوگا۔

یہ کہتے ہوئے میں ذرہ بھر بھی نہیں ڈرتا کہ مخدوم اپنے Theme (مرکزی تخیل) کے جوش اور اثر کی وجہ سے اپنے ہمعصروں سے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ چونکہ وہ خود ایک ایسے شعر مجسم ہیں، جس میں اجل کے قہقہے اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے - وہ زندگی کی آگ میں تپتے ہیں، وہ ساحل پر ٹھہر کر دریا کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگاتے۔ بلکہ تہ کی ساری ترکیبوں سے بطور خود واقف ہیں اس لئے ان کے کلام میں بلا کا جوشش ہے

مخدوم کے راسخ عقیدے اور اعجاز بیانی نے قوم کے جذبۂ عمل کو متحرک کر دیا ہے۔ ان کے پیام میں عظمت ہے چونکہ وہ زندگی کے عمیق مسایل بیان کرتے ہیں، تخیلات کے اسی اعجاز میں انسانیت اپنے لئے راہ عمل ڈھونڈھ لیتی ہے۔

مخدوم نے کہنے کی باتیں صاف صاف کہی ہیں ان کے پاس ادب اور زندگی دونوں میں ہم آہنگی ہے۔ وہ ابھی نوخیز ہیں ان کی اس انقلابی شاعری کو جنم لئے ہوئے تین چار سال ہوئے ہوں گے۔ مخدوم کے پاس ان ہیجانی و انقلابی احساسات کے باوجود فن کارانہ ضبط ہے جو ان کی کامیابی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اسی وجہ سے ان کا کلام اوروں کے لئے اثر پذیر بھی ہے وہ انقلاب کے بہت بڑے نقیب ہیں۔ مخدوم کی پختہ مشقی انھیں بہت بلند بنادے گی۔ وہ دن دور نہیں جب کہ مخدوم اپنے اس پیام میں اس مہم میں رہبری کے لئے سب سے ممتاز رہیں گے۔

محبوب حسین (عثمانیہ)

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علحدہ علحدہ خرید فرمایئں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں:-

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمایئں تو صرف بیس روپیہ میں مل جایئں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

قصاص کی کرُسی

امریکہ میں قاتل کا قصاص یوں ہوتا ہے کہ اُسے ایک کرُسی پر بٹھا دیا جاتا ہے اور پھر برقی رو دوڑا کر اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال قایم کیا گیا ہے کہ ہلاکت کا یہ طریقہ نہایت اچھا ہے اور انسان کو بہت کم تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس باب میں ایک افسانہ نویس، چارلس فرانسس پاٹر کا بیان پڑھئے، جس نے ایکبار خود اس منظر کو دیکھا تھا۔

مجھ سے ایک اخبار کے نمایندہ نے کہا کہ "آج گیارہ بجے کراؤلی کا قصاص ہونے والا ہے، چلو، تمھیں نفسیات انسانی کے ایک خاص پہلو کے مطالعہ کا موقعہ ملیگا اور ممکن ہے کسی افسانہ میں تم اس سے کام لے سکو۔ لیکن ہمیں قید خانہ میں ٹھیک نو بجے پہونچ جانا چاہئے"۔

ہم لوگ ٹھیک نو بجے قید خانہ کے دروازہ پر پہونچ گئے۔ وہاں پچاس تماشائی اور موجود تھے لیکن ان میں سے اکثر اخباروں کے نمایندے تھے۔ چونکہ دو گھنٹے باقی تھے، اس لئے یہ وقت باہمدگر اسی گفتگو میں بسر ہوا کہ قصاص کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی پھانسی کو بہتر سمجھتا تھا، کوئی زہریلی گیس کی رائے دیتا تھا اور کوئی بندوق کی۔ میرے لئے چونکہ یہ بالکل پہلا اتفاق ایسی صحبت میں شریک ہونے کا تھا، اس لئے خاموشی سے سن رہا تھا اور حیرت کر رہا تھا کہ ایسے دردناک موضوع پر یہ لوگ کیسے ٹھنڈے دل سے گفتگو کر رہے ہیں۔

جب وقت قریب آیا تو نمایندۂ اخبار نے جو میرے ساتھ آیا تھا کہا کہ "آؤ قریب کے کمرہ میں چلیں"۔ چنانچہ میں بھی سب کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ یہاں پہونچکر سب نے اپنی اپنی جیب سے وسکی کی بوتل نکالی اور مجھ سے بھی کہا کہ اس صحبت میں ان کا شریک ہوں۔ میں نے کہا کہ "میں شراب نہیں پیتا"۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ "اگر تم نہ پیوگے تو اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکوگے۔ ہم سب لوگ کیا احمق ہیں جو شراب پی پیکر قصاص دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہاں کا منظر ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب تک احساس کو کُند نہ بنا دیا جائے، برداشت مشکل ہے۔

میں نے کہا کہ "میں پورے حواس کے ساتھ اس کو دیکھنا چاہتا ہوں، میں نہ پیوں گا"۔

تھوڑی دیر میں سپاہیوں کا ایک دستہ آیا اور ہم کو ایک قطار میں کھڑے ہو جانے کا حکم دیا تاکہ ہماری جامہ تلاشی لی جائے۔ اس سے قبل کسی قصاص کے وقت کوئی نمایندۂ اخبار چھوٹا سا کیمرا چھپا کرلے گیا تھا اور اس نے تصویر لے لی تھی اس لئے اب یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ اندر جانے سے پہلے ہر شخص کے کپڑے، دیکھ لئے جاتے ہیں۔

ہر چند یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب قصاص کا پورا حال اخبارات میں لکھ کر شایع کیا جاتا ہے تو اسکی تصویر کی اشاعت میں کیا حرج ہے۔ تصویر دیکھ کر قدرتاً لوگوں کو اور عبرت حاصل ہونا چاہئے۔ بہر حال یہ موقعہ اس بحث وگفتگو کا نہ تھا۔ میں بھی سب کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا ہو گیا اور جب سب کی جامہ تلاشی ہو چکی تو ہم لوگ یکے بعد دیگرے قصاص کے کمرے میں پہونچے۔ لیکن ایک رپورٹر کا رنگ سفید پڑ گیا اور وہ یہ کہکر واپس آیا کہ پچھلے قصاص میں میری حالت خراب ہو گئی تھی، میں باہر جاتا ہوں، تم جو کچھ دیکھنا، مجھ سے زبانی کہدینا۔

اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا، نہ اسے حقیقتاً اپنے تاثرات کے لحاظ سے بیان کر سکتا ہوں اور نہ کبھی بھول سکتا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ اندر صرف ایک کرسی ہوگی جس پر قاتل کو بٹھا دیا جائے گا اور آناً فاناً برقی رو سے اسے ہلاک کر دیں گے۔ لیکن اندر پہونچکر دیکھا کہ چاروں طرف پچاس کرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور سامنے درمیان میں ایک بڑی کرسی مضبوط لکڑی کی رکھی ہوئی ہے اور کئی ایک تسمے چمڑے کے اس میں لٹک رہے ہیں۔

جب ہملوگ بیٹھ گئے تو ایسا گہرا سکوت دفعتاً چھا گیا کہ مینے اپنی عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ چند سکنڈ کے بعد پہلو کے کمرہ سے گارد کی حفاظت میں مجرم نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ کرسی کی طرف بڑھا۔ میں اسوقت ایسا محسوس کر رہا تھا، گویا خود موت آہستہ آہستہ قریب تر آتی جا رہی ہے۔ ایک پادری بھی ساتھ تھا۔

مجرم کرسی کی طرف بڑھا اور از خود بغیر کسی حکم یا ہدایت کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے زندگی کے ایسے نازک موقعوں پر بہت سے لوگوں کو حد درجہ مضطرب دیکھا ہے، لیکن اس شخص کے سکون کا عالم نہایت حیرتناک تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی فریضۂ زندگی کو ادا کر رہا ہے۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی ہاتھ اُٹھا کر گارد کے سپاہیوں سے کہا کہ "خدا حافظ" اور اس کے بعد ہی نہایت تیزی سے اس کے ہاتھ پاؤں تسموں سے باندھے جانے لگے۔ اس کا جسم کسا جا رہا تھا اور وہ خاموش نگاہیں نیچی کئے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس نے جیلر سے کہا کہ "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ میری ماں کو میرا آخری سلام پہونچا دیا جائے"۔

اس کے بعد قصاص ہونے ہی والا تھا کہ اس نے جیلر سے کہا کہ داہنے پاؤں کا تسمہ ذرا ڈھیلا ہے، اسے کس دیا جائے چنانچہ تسمہ کس دیا گیا اور اس کے بعد ہی فوراً سگنل دیدیا گیا۔

مینے یہ تو دیکھا کہ کرسی کو غیر معمولی جھٹکا لگا، لیکن اس کے بعد جو کچھ نظر آیا وہ ناقابل بیان ہے۔ بجلی کی رَو اس کے

ایک ایک ریشہ میں دوڑ گئی اور جسم کی اینٹھن کا یہ عالم ہوا گویا کوئی بڑا قوی جانور ہی جو چمڑے کے تسموں سے کسدیا گیا ہے اور وہ انھیں توڑکر نکل جانا چاہتا ہے۔ تسمے چرچرا رہے تھے، کرسی جھٹکے کھا رہی تھی اور ہم لوگ ایسا محسوس کر رہے تھے کہ تسمے ٹوٹ کر یہ ہم پر جھپٹنے ہی والا ہے۔

برقی رَو یکے بعد دیگرے برابر دوڑائی جا رہی تھی اور ہم لوگ ہر دفعہ اپنی کرسیوں پر پیچھے کی طرف ہٹ ہٹ جاتے تھے کہ کہیں یہ ہم پر نہ آگرے۔

ہم نے سنا تھا کہ اس طرح انسان کو کوئی تکلیف نہیں پہونچتی اور فوراً ہلاک ہو جاتا ہے، لیکن اس قصاص کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ سب غلط تھا۔ اس کی تکلیف کا یہ عالم تھا گویا اس کا ایک ایک ریشہ موت کا مقابلہ کر رہا ہے اور موت ہر مرتبہ اپنی گرفت میں لاکر جھٹکے پر جھٹکے دے رہی ہے جھنجھوڑ رہی ہے اس کے ساتھ ہی بیٹنے اس کے جسم سے پسینہ ٹپکتے دیکھا۔ گویا بجلی کے چوٹھے پر کسی انسان کو بھونا جا رہا تھا اور اس کے جسم کا عرق نکل نکل کر لباس میں جذب ہو رہا تھا اس کے بعد وہ ناقابل برداشت منظر سامنے آیا جس کے ڈر کی وجہ سے لوگ شرابیں پی پی کر یہاں آتے ہیں، یعنی ایسی بُو محسوس ہونے لگی جو گوشت جلنے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور یہ چراہند ایسی تیز، ایسی متعفن اور اس قدر امتلا پیدا کرنے والی تھی کہ معاذاللہ!

ہر چند یہ منظر صرف پانچ منٹ سامنے رہا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹوں گزر گئے۔ جب قصاص کے بعد اسکے جسم کو لاش کی گاڑی میں ڈالکر اسپتال پہونچایا جانے لگا، تو میں نے اسے پھر دیکھا۔ وہ بالکل پھول گیا تھا اور ایسا سرخ تھا گویا جسم کی کھال نکال لی گئی ہے۔

نگار کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۲ء (غالب نمبر)۔ غالب شوخ نگار (نثر و نظم کی حیثیت سے صفحات ۱۵۶ مع تصویر غالب (رنگین) قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۵ء (اُردو شاعری نمبر)۔ اُردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام جو ہر حیثیت سے مکمل ہے۔ صفحات ۲۳۶۔ مع بعض صاحب قلم کی تصاویر کے جس میں جناب نیاز صاحب کی قلمی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت عا علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۶ء (ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ علاوہ محصول۔

جنوری سنہ ۳۷ء:۔ ڈرامہ اصحاب کہف۔ خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے صفحات ۱۴۴۔ قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۸ء:۔ تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس دقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کیگئی ہے اسکا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا۔ صفحات ۱۵۲ قیمت عا

جنوری سنہ ۳۹ء (مصحفی نمبر) اسکے بعض عنوان حیات مصحفی۔ مُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ صفحات ۱۲۴ قیمت عہ

جنوری سنہ ۴۰ء:۔ (نظیر نمبر) بعض عنوانات۔ نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۲۸۔ قیمت عہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

علم کی طیار کی ہوئی دوزخ

حال کی جنگ ہسپانیہ میں جب بارسلونا فتح ہوا اور جنرل فرانکو وہاں پہونچا تو اسے بعض تہ خانے ایسے نظر آئے جن سے تعزیر گاہ یا تعذیب گاہ کا کام لیا جاتا تھا اور جنرل فرانکو کے وہ سپاہی جو گرفتار ہو جاتے تھے ان میں سے بعض کو ان تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔

ان تہ خانوں میں نہ کوئی شکنجہ ہے، نہ زنجیر، نہ کوئی درّہ ہے اور نہ کوئی آلۂ تعزیر، لیکن پھر بھی وہ اتنی سخت تعذیب گاہیں ہیں کہ شاید ہی ذہن انسانی نے ان سے زیادہ ظالمانہ طریقے انسان کو تکلیف پہونچانے کے کوئی اور وضع کئے ہوں۔

نفسیات کا مسلّم مسئلہ ہے اور اس سے پہلے بھی لوگوں کو معلوم تھا کہ ایک خاص حد تک پہونچکر جسمانی تکلیف کا بڑھنا رُک جاتا ہے بلکہ شاید اس میں کمی ہونے لگتی ہے۔ مثلاً آپ ایک شخص کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکیں تو اول اول یقیناً اسے بہت اذیت ہوگی، لیکن وہ اذیت ایک خاص حد تک پہونچنے کے بعد رُک جائے گی اور شاید اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے کہ درد کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔ بہر حال جسمانی اذیت کی ایک انتہا ہے، لیکن انسان کے حواس اور نفس کے ذریعہ سے جو تکلیف اس کو پہونچتی ہے اس کی کوئی حد و انتہا نہیں اور یہ تہ خانے اسی علمی اُصول پر طیار کئے گئے تھے۔

یہاں نہ قیدیوں کو شکنجہ میں کسا جاتا تھا، نہ گرم لوہے سے داغا جاتا تھا، نہ ان کی آنکھیں نکالی جاتی تھیں، نہ ٹکٹکی میں باندھ کر درّوں سے جسم کی کھال اُڑائی جاتی تھی۔ لیکن جس عذاب میں وہ مبتلا کئے جاتے تھے وہ ان سب سے زیادہ سخت تھا۔

تہ خانوں کی دیواروں پر مختلف قسم کے رنگین دائرے اور دوسری ہندسی شکلیں بنائی گئی تھیں، مختلف رنگ کی تیز روشنیاں ڈالنے کا انتظام تھا، ایک ہی قسم کی آوازیں مسلسل پیدا کی جاتی تھیں اور یہی وہ عذاب تھا جس میں قیدی مبتلا کئے جاتے تھے، اور جس کا برداشت کرنا انسانی قوت سے باہر ہے۔

برسلونا کے تہ خانوں کی یہ تعمیر اور اس کی نقاشی ایک شخص الفانسو لارنٹ سک (Alfanso Laurent Cik)

نے کی تھی جو یوگوسلاویا کا ایک نہایت ذہین انجینئر و نقاش تھا اور اس کا بیان ہے کہ حکومت اسپین کی خفیہ پولیس نے بہ جبر اس سے یہ سب کچھ طیار کرایا تھا۔

دیواروں پر جو نقوش، دایروں، سیدھے ٹیڑھے خطوط اور دوسری ہندسی شکلوں میں نظر آتے ہیں یہ سب حال ہی کے طیار شدہ ہیں اور تعذیب و تعزیر کی دنیا میں بالکل نئی چیز ہیں۔

ان نقوش کے ذریعہ سے تکلیف پہونچانے کا خیال اس اصول پر قایم ہے کہ اگر خاص قسم کے دایرے یا نقوش مختلف روشنیوں میں نگاہ کے سامنے ہر وقت رہیں تو رفتہ رفتہ تکلیف برابر بڑھتی جاتی ہے حتےٰ کہ انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات نہایت لغو و مہمل معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ اس صفحہ پر جو دایرے بنائے گئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو آنکھ کے پاس لیجائیے اور جلدی جلدی نصف انچ کے دایرہ میں ان کو برابر گردش دیتے رہئے شاید چند سکنڈ بھی آپ اسے برداشت نہ کر سکیں گے اور اسی پر قیاس کیجئے کہ اگر اس قسم کی تکلیف مسلسل پہونچتی رہے تو آپ کا کیا حال ہوگا۔

ان بصارت آزار تہ خانوں میں علاوہ دایروں کے کچھ نقوش مکعب قسم کے بھی بنے ہوئے تھے جن کو غور سے دیکھنے کے بعد کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خالی صندوقوں کے نقشے ہیں اور کبھی ٹھوس مکعب نظر آتے تھے۔ مثلاً:-

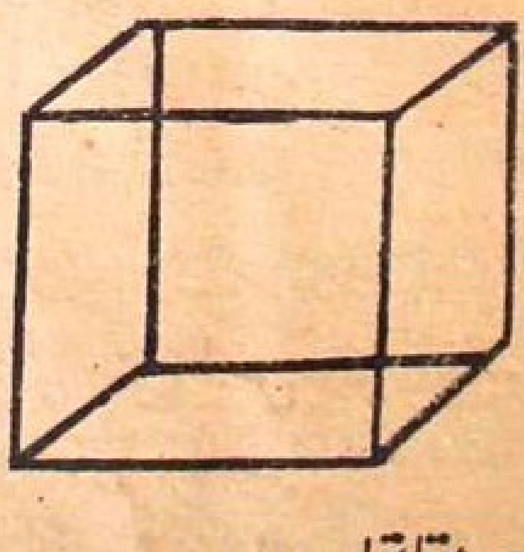

اور ان کا اثر بھی بصارت پر نہایت تکلیف دہ ہوتا تھا۔

یوں تو آپ کو یہ کھیل نظر آئے گا، کیونکہ آپ کے اختیار میں ہے جب تک آپ چاہیں دیکھتے رہیں اور پھر آنکھیں بند کرلیں لیکن ان تہ خانوں کے قیدیوں کو یہ اختیار حاصل نہ تھا۔ قدیم زمانہ میں آنکھیں کھلی رکھنے کے لئے پپوٹے کاٹ دئے جاتے تھے۔ لیکن یہاں پپوٹے کے اوپر آہنی چھلے چڑھا دئے جاتے تھے تاکہ وہ بند نہ ہوسکیں اور چونکہ ہاتھ پاؤں قیدیوں کے باندھ دئے جاتے تھے اس لئے وہ ان کمانیوں کو ہٹا بھی نہ سکتے تھے۔ جس طرف دیکھتے تھے یہی دایرے اور نقشے انھیں نظر آتے تھے اور اگر اس طرف سے نگاہ ہٹتی تھی تو پھر نہایت تیز روشنیوں پر پڑتی تھی جو اور زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتی تھیں۔ رنگوں کے ذریعہ سے بھی عذاب پہونچانے کا یہاں انتظام تھا۔ صرف سیاہ و سفید دایروں سے بھی نگاہ کو تکلیف پہونچتی ہے، لیکن اگر ان کو مختلف رنگوں سے رنگ دیا جائے اور بہت سی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں بھی مختلف رنگ کی نگاہ کے سامنے رہیں تو یہ تکلیف دوچند ہوجاتی ہے، چنانچہ ان تہ خانوں میں یہ بھی انتظام تھا کہ نہایت تیز روشنیاں مختلف رنگوں کی بدلتی رہتی تھیں اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ دیواروں کے دایرے اور نقشے عجیب وغریب صورتیں اختیار کرکے سامنے آتے تھے اور قیدیوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھوتوں کی دنیا میں آگئے ہیں۔

اگر آپ سورج کی طرف تھوڑی دیر تک دیکھتے رہئے اور پھر ادھر سے نگاہ ہٹا لیجئے تو آپ کو نگاہوں کے سامنے روشن دھبے ناچتے ہوئے نظر آئیں گے کیونکہ قرص آفتاب کی تصویر پردۂ چشم پر مرتسم ہوجاتی ہے۔ بالکل یہی حال رنگ کا بھی ہے آپ غور سے دیر تک کسی ایسی تصویر کو دیکھئے جو نہایت سرخ رنگ میں بنائی گئی ہو اور پھر نگاہ ہٹا لیجئے تو آپ کو دیوار پر وہی تصویر سبز رنگ کی نظر آئے گی کیونکہ سبز رنگ سرخ رنگ کا معادل ہے۔ اب آپ خیال کیجئے کہ ان تہ خانوں کے قیدیوں کا جو تیز روشنی میں ان تیز رنگوں کے نقوش کو مسلسل دیکھنے پر مجبور تھے، کیا حال ہوتا ہوگا اور اُن کی چکاچوند کتنی تکلیف کا باعث ہوتی ہوگی۔ رنگوں کا انسانی دماغ کو متاثر کرنا یقینی ہے لیکن مختلف لوگوں کی دماغی حالت پر مختلف رنگوں کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کا پورا حال ماہر نفسیات کو ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا، لیکن سرخ اور بنفشی رنگ کا ہیجان انگیز ہونا ثابت ہوچکا ہے اور شاید سرخ رنگ کو خطرہ اور جنگ کا رنگ قرار دینا اسی لئے ہے۔ جس طرح رنگ اور روشنی کے ذریعہ سے انسانی دماغ کو تکلیف پہونچ سکتی ہے، اسی طرح آواز سے بھی پہونچائی جاسکتی ہے اور ان تہ خانوں میں ایک خاص حصہ ایسا بھی تھا جہاں سامعہ کے ذریعہ سے قیدیوں کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ کئی ایک پنڈولم لٹکائے گئے تھے جن سے ٹک ٹک کی آواز ہر وقت پیدا ہوتی رہتی تھی، لیکن یہ قیدیوں کے کان میں اتنی اونچی ہوکر پہونچتی تھی گویا بہت بڑا ڈھول کان کے پاس بجایا جارہا ہے۔ اور وہ رات دن ہر لمحہ ان آوازوں کو سننے پر مجبور تھے۔

ایک حصہ اس قید خانہ کا ایسا بھی تھا جہاں قیدیوں کو برابر سنگین فرش پر چلنا پڑتا تھا اور ان کے قدموں سے جو آواز پیدا ہوتی تھی وہ بعض آلات کے ذریعہ سے اتنی بلند و کرخت ہوکر ان کے کانوں میں پہونچتی تھی کہ وہ دیوانے ہوہو جاتے تھے ان قیدیوں کو ایک جگہ ٹھہرنا ممنوع تھا اور جو کوئی ایسا کرتا تھا اسے کوڑے مار مار کر آگے بڑھایا جاتا تھا۔

مکتوبات نیاز

خط پہونچا، اب کیا پوچھتے ہو کہ کس ادھیڑ بن میں لگا ہوا ہوں۔

"تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا" ـــ صرف شاعری ہے، حقیقت نہیں ـــ حقیقت یہ ہے:

ہم کیا بدل گئے، کہ زمانہ بدل گیا

سو، اب یہ دیکھو کہ "ہم" کیا ہیں؟ کچھ نہیں! ـــ میر علیہ الرحمۃ نے شاید اسی منزل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

القصہ، نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم،

سو، بھئی اب تو معاملہ اسی "نہیں ہم" کا ہے۔

وہ گلیاں، جن میں ہم تم خاک چھانا کرتے تھے اب بھی وہی ہیں۔ لیکن جن ذروں کی طرف پہلے دل کھنچتا تھا، آج وہی آنکھیں دکھا رہے ہیں، آفتاب کا طلوع و غروب وہی ہے، لیکن پہلے غروب کی خوشی اس لئے ہوتی تھی کہ اسکے بعد طلوع ہوگا، اب طلوع سے بھی رنج پہونچتا ہے کہ اس کے بعد غروب ہے۔ پہلے کائنات کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے چڑھتی ہوئی "ہوائی" کو دیکھتے ہیں، آج اس کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ "ہوائی" زمین کی طرف آرہی ہو ـــ بے نور، بے رنگ!

لوگ کہتے ہیں، سمجھ چالیس کے بعد آتی ہے۔ لیکن اگر سمجھ اسی کا نام ہے تو شاید موت دنیا کی سب سے بڑی "سمجھ" ہے ـــ جوان جینا اور جوان مرجانا بھی کتنی بڑی نعمت ہے ـــ پھول وہی ہے جو کھلتے ہی ٹہنی سے چن لیا جائے۔ خشک ہونے پر زمین سے اس کی پنکھڑیاں کوئی چنتا بھی ہے تو پھول سمجھ کر نہیں بلکہ کیاری صاف کرنے کے لئے!

ابھی نہیں، کچھ دن اور گزر جانے دو، اس وقت تم اس کو بہتر سمجھ سکوگے ـــ میں پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کا قایل نہیں، لیکن ہرزہ گردی کو بھی جی نہیں چاہتا۔ میں تمہارا ساتھ کیونکر دے سکتا ہوں۔

حضرت، آپ کے شکوۂ محبت کی قدر کرتا ہوں اور معذرت خواہ ہوں کہ واقعی مجھ سے سخت کوتاہی ہوئی۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ میری یہ سادگیِ بیان آپ کو اور زیادہ برہم نہ کردے۔

میں یہیں تھا، لیکن سچ پوچھئے تو نہیں تھا۔ ایک عزیز دوست کی علالت نے اس قدر سراسیمہ رکھا کہ دنیا کا کوئی کام سوائے ان کی تیمار داری کے کر ہی نہ سکا۔ گو، اب خطرہ باقی نہیں، لیکن میری فکر اب بھی وہی ہے، بیماری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اُن کی ضد کی وجہ سے!

بہرحال اگر اب بھی وقت ہو تو لکھئے، تعمیل ارشاد کے لئے آمادہ ہوں۔ وہ خود یہیں آتے رہتے ہیں، میرے جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر انھیں ماننا ہے تو یوں بھی مان لیں گے، میری نقل و حرکت سے کیا ہوتا ہے۔

یہ آپ نے خوب کہا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ آپ کو کیا خبر کہ ابھی دل میں کیا کیا ہے!

نالہ بسیار و آہ بسیار ست

درد را دستگاہ بسیار ست!

نہ قسمت کا قایل ہوں نہ اس بات کا کہ "ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے"۔ آپ نے نہ دیکھا ہو لیکن مینے تو بارہا تدبیروں سے قسمت کو اُلٹ جاتے دیکھا ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ اب میں کیا کرنے والا ہوں۔ لیکن ابھی تک مجھے خود نہیں معلوم۔ ہاں مایوس نہیں ہوں اور جانتا ہوں کہ آج نہیں تو کل نئی راہیں پیدا ہوں گی۔ ارادہ ہے کہ اخیر جنوری میں یہاں سے روانہ ہوں اور اسوقت تک واپس نہ ہوں، جب تک اُدھر یا اِدھر آخری فیصلہ نہ ہو جائے۔ آپ کو البتہ تھوڑی سی مدد کرنا پڑے گی لیکن ابھی نہیں، عین وقت پر بتاؤں گا، تاکہ آپ کو بہانہ تلاش کرنے کی فرصت کم مل سکے۔

زندگی کے کھیل میں دلچسپی پیدا کرنا ہو، تو پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھئے، ٹھوکریں کھائیے اور قدم آگے بڑھائیے، منزل تک پہونچ جانا، شاید اس قدر دلچسپ نہیں، جتنا منزل تک پہونچنے کا خیال۔ بہرحال دیکھتے جائیے کیا ہوتا ہے۔ ابھی آپ کی قیاس آرائیاں قبل از وقت ہیں۔

نیاز نوازیوں کا شکریہ، لیکن یہ آپ نے کیا فرمایا کہ آپ سے دور ہو کر میں نے آپ کو بھلا دیا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ

مانندِ شعلہ، حُسن ترا پشت و رو یکے ست

آپ سامنے ہوں یا نہ ہوں — "عالم ہے وہی جلوہ گری کا!"

قدرت کی طرف سے جن کے لئے زخم کھانا اور تڑپنا مقسوم ہو چکا ہے۔ ان کے لئے آپ کو کیوں اتنی فکر رہتی ہے نگاہوں کے نشتر نہ سہی، جنگل کے کانٹے سہی۔ آپ نہیں آپ کی یاد تو ہے،

دل و صد آرزوئے خام، بدل

یار و چندیں فریب، و من تنہا!

یقیناً پچھلی بار آپ سے بہت رواروی میں ملنا ہوا۔ مجھے خدا جانے کیا کیا کہنا تھا، لیکن نہ کہہ سکا، اور آپ نے بہت سی وہ باتیں بھی کہہ ڈالیں جو نہ کہنا چاہئے تھیں۔ چنانچہ آپ نے نئے پیدا ہونے والے تعلق کا بھی ذکر مجھ سے کیا تھا؛ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ تکمیل کو پہونچا یا نہیں؟ تحریر کے سرورق پر جو پتہ درج ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک نہیں ہوا، لیکن ہو سکتا ہے کہ "اُدھر" ہو" اور اِدھر اس کا اظہار نہ ہو۔ دو دھاری تلوار کا کیا کہنا!

آپ میرے اس استفسار سے بدگمان نہ ہوں۔ لیکن یہ بھی نہ پوچھیں کہ میں یہ کیوں پوچھتا ہوں۔ بس پوچھتا ہوں، یونہی پوچھتا ہوں — "چہ تواں کرد، مرا با تو سرے اُفتادست"

اگر فرصت ہو تو کبھی کبھی یاد کر لیا کیجئے۔ اور میری اس حسرت کو کبھی نہ بھولئے کہ

نہ با تو رفتم و نے بے تو در غمت مُردم
یکے ز دست نیامد ازیں دو کار مرا

آپ کا خط، جسے "شہر آشوب" کہنا زیادہ موزوں ہے، پہونچا۔ یوں کہئے آپ کی جوانمردی کی تعریف کر دوں، لیکن "جوانمرگی" کی بات ہی اور ہے۔ آپ لطف و مسرت کی جستجو کرتے ہیں اور یہاں یہ عالم ہے کہ

باز می جویم دلِ افسردہ را
آں دل و آں خاطرِ آزردہ را

آپ کو کیا خبر کہ "تنہا ملول بودن و تنہا گریستن" بھی ایک عالم ہے۔

انسان پر بعض اوقات دو حالتیں نہایت عجیب گزرتی ہیں، ایک، بغیر سوچے کام کرنے کی اور دوسری، بغیر کچھ کئے ہوئے سوچتے رہنے کی۔ آپ اُس عالم سے گزر رہے ہیں اور میں اس عالم سے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ یعنی نہ آپ کو اپنی سرگردانی سے کچھ ملنا ہے اور نہ مجھے اپنی حیرانی سے!

زخمہا دارد تفاوت درمیاں
ورنہ خار و نشتر و مژگاں یکے ست

مجھے وعدہ یاد ہے اور اس کے ایفا کا بھی ارادہ رکھتا ہوں۔ لیکن آپ کے تقاضہ سے نہیں، اپنی خوشی سے۔ پھر ایسی جلدی کیا ہے۔ وقت آنے دیجئے، میں اور میری تمام "نارسائیاں" آپ کے لئے وقف ہیں۔

تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تم سے خفا ہوں اور اس قدر خفا ہوں کہ بات کرنا پسند نہیں کرتا، پھر کس اُمید پر مجھ سے خط و کتابت کی جرأت کرتے ہو۔ تم نے جو صدمہ مجھ کو پہونچایا ہے وہ ایسا نہیں جسے میں آسانی سے بھول

جاؤں - میں جانتا ہوں کہ تمھارے پاس "عذر ہائے لنگ" کی کمی نہیں اور شاید اسی اعتماد پر تم نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن میں بھی اتنا احمق نہیں کہ آنکھ بند کرکے تمھاری ہر بات کو مان لوں !

"در توبہ" کبھی بند نہیں ہوتا یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو ہمیشہ گناہ کرنے کے لئے طیار رہتے ہیں - اس لئے تمھارے "اعتراف" کی قیمت مجھے معلوم ہے - "بت شکنی" کا کفارہ "تعمیر کعبہ" سے بھی نہیں ہو سکتا، تمھاری جھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے !

قبلۂ محترم

آپ کا ادنیٰ اشارہ میرے لئے "فرمانِ خداوندی" ہے، چہ جائیکہ آپ کسی بات پر اتنا اصرار فرمائیں - مجھے حیرت ہے کہ آپ نے مجھ سے پوچھا کیوں - مجھے کس قدر مسرت ہوتی اگر بغیر مجھ سے پوچھے ہوئے، آپ میری طرف سے انھیں مطمئن کر دیتے -

انھیں بھیجئے، میری ہر امکانی کوشش ان کے لئے وقف ہے، لیکن کامیابی کے لئے غالباً آپ کے روحانی تصرف کی بھی ضرورت ہوگی -

---

کعبۂ مستمنداں ، ایک زمانہ ہو گیا کہ آپ مجھ سے بےخبر ہیں - ڈر رہا ہوں کہ اس کا سبب ناخوشی تو نہیں ــــ درگاہِ گرامی کے ساتھ مجھے لاکھ عقیدتمندیاں سہی - لیکن "ردو قبول" کا اختیار تو حضرت ہی کو حاصل ہے - اور میں شاید اس منزل سے ابھی دور ہوں جب "سجدہ" بے نیازِ "مسجود" ہو جاتا ہے -

میری آشفتہ خیالیاں بدستور اپنی جگہ قایم ہیں اور اگر ان میں کوئی تغیر ہوا بھی تو یہ کہ اب نہ "نالۂ نیم شبی" میں کوئی لطف باقی رہا نہ "دعائے صبحگاہی" میں ــــ حاضری کا ارادہ کر رہا ہوں، لیکن اس کی تکمیل میرے اختیار میں نہیں - ہاں، اگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند !

سید صاحب قبلہ آج کل کہاں ہیں ؟ اگر وہاں ہوں تو میرا سلام قبول فرمائیں -

---

شادی مبارک ! عدم شرکت کا مجھے واقعی سخت افسوس ہے، لیکن تمھارا اصرار بھی کچھ یونہی سا تھا، نہایت کمزور قسم کا ــــ ورنہ میرا نہ پہونچنا کیا معنی ؟

"ہنی مون" کا زمانہ کہاں بسر کیا جائیگا ؟ بنگلور میں ؟ یہ میں تم سے نہیں پوچھ رہا، بلکہ کسی اور سے پوچھ رہا ہوں ــــ جواب تمھیں دو گے لیکن وہ تمھارا نہ ہوگا - ہو سکتا ہے کہ آیندہ ماہ کی کسی تاریخ میں بمبئی جانا پڑے - اسلئے میری جو رائے ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے

سچ کہتا ہوں میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ تم کو خط نہ لکھوں گا
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

تمھاری علالت کا حال سنکر دل بیچین ہو گیا۔ خدا کے لئے لکھو کہ معالجہ و مداوا کی کیا صورت اختیار کی ہے، وہ حرارتِ جگر ہو یا التہابِ خون، ان میں سے کسی کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو تمھیں جگہ بدلنا چاہیئے اور گوشت یک لخت ترک۔

قدرت اگر بیمار ڈالتی ہے تو علاج بھی کرتی ہے۔ کھلی ہوئی صاف و خشک ہوا، پھلوں کا استعمال، مقررہ اوقات پر مقررہ ہلکی غذا اور دماغی سکون ۔۔ سب سے زیادہ ضرورت ان چیزوں کی ہے اور یہ تمھیں وہاں میسر نہیں آسکتیں۔ پہاڑوں پر جانے کا موسم نہیں ہے اس لئے کم مرتفع مقامات کا انتخاب مناسب ہوگا۔ اس صوبہ میں دیرہ دون، اور پنجاب میں کیمبل پور بہترین مقامات ہیں۔

اگر واقعی تم اس کے لئے طیار ہو (اور طیار نہ ہونا کیا معنی، ہونا پڑے گا) تو مجھے لکھو، میں خود تمھارے ساتھ چلوں گا۔ مرض چھوٹا ہو یا بڑا، ابتدا ہی میں اس کی روک تھام ہونی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس باب میں ضد سے کام نہ لوگے اور بواپسی ڈاک مجھے اطلاع دوگے کہ کس تاریخ تک جانے کا ارادہ ہے، اس کی ضرورت نہیں ہے کہ پہلے سے انتظام کیا جائے۔ میں تو تمھارے ساتھ ہوں، سب ہو جائے گا۔

یہ بالکل صحیح ہے موت کا ایک وقت مقرر ہے، لیکن وقت قدرت کا مقرر کیا ہوا نہیں ہے بلکہ خود انسان اُسے مقرر کرتا ہے اور ٹال بھی سکتا ہے اگر وہ چاہے۔ صحت کی حالت میں وہ طنطنہ اور ذرا سی بیماری میں یہ کم ہمتی! کس قدر شیوۂ مردانہ کے خلاف ہے۔ عزمِ انسانی کے معجزے تم نے ابھی دیکھے ہی نہیں۔ ٹھہرو، میں آتا ہوں۔ تمھیں کافر بنا کے نہ چھوڑا ہو تو بات نہیں!

تم نے بالکل صحیح سنا ہے۔ واقعی ایک زمانہ سے میرے ان کے درمیان سلسلۂ مراسلت بند ہے، لیکن اسکا سبب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ آخری بار ان سے دلی میں ملنا ہوا تھا اور ایک ہفتہ تک برابر ساتھ رہا ۔۔۔ شاید تین چار سال کی بات ہے ۔۔۔ اس کے بعد وہ ایران چلے گئے اور وہاں سے عراق وغیرہ ہوتے ہوئے چھ مہینے کے بعد واپس آئے۔ ان کے خطوط برابر آتے تھے ۔۔۔ واپسی پر انھوں نے ایک خاص معاملہ میں مجھ سے مشورہ چاہا تھا اور وہ میں ان کی خواہش کے مطابق نہ دے سکا۔ اس کے بعد پھر انھوں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اور مجھے بھی کوئی موقعہ یہ سوچنے کا نہ ملا کہ وہ کیوں خاموش ہیں۔

بعد کو مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے میرے مشورہ پر عمل نہیں کیا اور کافی نقصان اٹھایا۔ ہو سکتا ہے

کہ یہ حجاب اسی لئے ہو - بہر حال، میں انھیں لکھتا ہوں - اگر مان گئے تو خیر، ورنہ اس میں نقصان ہی کیا ہے -

---

ابھی ابھی تمھارا کارڈ ملا ، میں تمھاری محبتوں کا معترف ہوں اور اسی اعتماد کی بنا پر تم کو کبھی خط بھی نہیں لکھتا - تم نے خواب بالکل غلط دیکھا - میں بالکل اچھا ہوں اور فی الحال پندرہ بیس سال تک بیمار پڑنے کا ارادہ بھی نہیں - تقدیر دں کو پلٹ دینے والا انسان ہوں، تمھیں معلوم نہیں ؟

یہ مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل کی خبرِ مرگ مجھے کیوں سنائی - کیا کوئی بڑے مردِ معقول تھے ؟ میں تو اُن سے واقف نہ تھا - امسال عرس میں ضرور شریک ہوں گا - مولانا مرحوم کی خصوصیات جسوقت یاد آجاتی ہیں تو دل تڑپ اُٹھتا ہے - سرزمین رامپور کا سب سے پہلا اور آخری انسان تھا -

عرشی صاحب سے میرا سلام کہد و - مجھے اُن سے باوجود اُن کے مولوی ہونے کے بڑی محبت ہے -

چند دن ہوئے اتفاق سے اسماعیل (ذبیح) ملنے آگئے - بڑی مشکل سے میں نے انھیں پہچانا، اب تو بھئی، وہ مکہ میں رہتے ہیں - کیا کہہ سکتا ہوں - دُہائی ہے کعبہ والوں کی !

مکرمی - آپ نے جو تجویزیں نگار کی ترتیب کے متعلق سوچی ہیں وہ یقیناً ملک کے لئے بہت مفید ہیں، لیکن کوئی ایسی تجویز بھی تو سوچئے کہ ملک ، نگار کے لئے مفید ثابت ہو - خشک داد سے کب تک کام چلے گا - اٹھارہ سال کی جانکاہی کا صرف یہ نتیجہ کہ آپ "سبحان اللہ" کہکر خاموش ہو رہیں، اور میں خون کا سا گھونٹ پیکر رہجاؤں کم از کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں -

بزمِ جم آخر شد و وقتِ صبوحِ ما رسید

طرحِ دیگر می تواں انداخت دورِ جام را

لیکن یہ "طرحِ دیگر" کیا ہو سکتی ہے ؟ سوائے اس کے کہ جام و مینا کو چور چور کر دیا جائے اور بساط کو ہمیشہ کے لئے اُلٹ دیا جائے - اب تو یہی سوچ رہا ہوں -

---

ایک غلطی کی تصحیح

جناب حمید سکریٹری بزم نظیر آگرہ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ نظیر کی قلمی تحریر جسکا عکس نگار کی گزشتہ اشاعت میں شایع ہوا ہے، انھوں نے بھیجی تھی - افسوس ہے کہ مجھے یاد نہیں رہا اور ایک دوسرے صاحب کا نام درج ہوگیا - جناب حمید امید ہے معاف فرمائیں گے -

نیاز

جامعہ میں ایک مہمان کے ساتھ

"۔۔۔اور سب سے بڑی بات جس میں سمجھئے کہ جامعہ کے وجود کا راز بھی پوشیدہ ہے، یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے ساتھ خود بھی بنتے رہے۔ جامعہ کی کارگزاری، ہمارے دلوں کی کیفیت ہماری واردات قلبی سے جدا نہیں کیجا سکتی۔ جامعہ کوئی ادارہ یا اداروں کا مجموعہ نہیں ہے، ہمارے دلوں کی کہانی بھی ہے۔ کوئی عمارت یا عمارتوں کا مجموعہ نہیں ہے بہتے چشموں کا ایک جال سا ہے کہ جس سے زمین سیراب اور بستی شاداب ہوتی ہے۔"

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

جامعہ ملک کا وہ واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں تعلیم ایک مخصوص نصب العین کے ماتحت دیجاتی ہے۔ چنانچہ دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلہ میں ملک کے بچوں اور نوجوانوں کے ساتھ جامعہ کا سلوک بالکل مختلف ہے۔ عموماً ہمارے تعلیمی ادارے یہی اپنے فرض کی انتہا سمجھتے ہیں کہ سال بعد سال اپنے طلبہ کو کتابیں پڑھا کر ان میں بعض مہارتیں پیدا کرنے کی کوشش کریں اور آخری درجوں میں اپنے طلبہ کو کسی پبلک امتحان میں شریک کرا کے ان کے اہل یا نا اہل ہونے کا فیصلہ کرا دیں۔ گویا ان اداروں کا سلوک اپنے طلبہ کے ساتھ اس سوتیلی ماں کا سا ہے جو اگر بچوں سے پیار بھی کرتی ہے تو اس نیت کے ساتھ کہ وہ بد سے بدتر اور ناکارہ سے ناکارہ تر بنجائیں۔ نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہئے یعنی جس وقت ہمارا طالبعلم فارغ التحصیل ہو کر دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اپنے کو ایک اجنبی کی حیثیت میں پاتا ہے اور اپنے آپ کو اجنبی کیوں نہ سمجھے، مدرسہ اور سماج کے درمیان اسے ایک ایسی خلیج نظر آتی ہے جس کا کبھی اسے تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی باعث ہمارے طالبعلم کے دماغ میں ایک نہایت تکلیف دہ کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر یا تو وہ اپنی تعلیم کو یکسر فریب اور اُستادوں کو فریب کار سمجھنے لگتا ہے یا پھر دنیا کے ہر مطالبہ کو ہیچ اور مہمل سمجھکر اسے ٹھکرا دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ لیکن اس فیصلہ کا نتیجہ اکثر یہی نکلتا ہے کہ دنیا کا تو کچھ نہیں بگڑتا البتہ ہمارا طالبعلم ہی خودکشی میں پناہ ڈھونڈھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ تعلیم جو ان نتائج کی حامل ہو دنیا کے کسی ملک کے لئے سازگار ثابت نہیں ہو سکتی اور بالخصوص اس ہندوستان کے حق میں جس کی آزادی ہنوز ایک خواب بے تعبیر کی حیثیت رکھتی ہو، جس کی معاشرت تباہ اور جس کا تمدن برباد کیا جا چکا ہو یہ تعلیم پوری لعنت ہے۔ مروجہ تعلیم کے بانی نے چاہا تھا کہ اس تعلیم کے ذریعے غلام پیدا ہوں۔ چنانچہ غلام پیدا ہوئے اور پیدا ہو رہے ہیں۔ آج میکالے کی روح اور سیاست کی روٹی کھانے والے انگریز کا دل اپنی کامیابی پر کسقدر نازاں و

فرحاں ہوگا!

ملک پر جامعہ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اس تعلیمی گرم گھر کے جس میں ہماری قوم کے دل و دماغ کو مفلوج و ماؤف بنایا جاتا تھا کچھ شیشے توڑ کر اس میں تازہ ہوا کے داخل ہونے کا راستہ بنا دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ خود اپنی جگہ تعلیم کے جھوٹے طلسم کے جواب میں ملک کے سامنے سچی تعلیم اور اس کی کامیابی کی وہ مثال پیش کی ہے جو معجزہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی حقیقت کی بنا پر مسٹر اسی سالٹر ڈیویز (ڈائرکٹر تعلیم، کینٹ، انگلینڈ) نے جامعہ پر اپنی رائے کے دوران میں کہا ہے "۔۔۔ آپ سخت مشکلات کے باوجود ان اُصولوں پر عمل کر رہے ہیں جنھیں نظری طور پر سب نے تسلیم کر لیا ہے مگر عملاً ہمارے مدارس بہت ہی آہستہ آہستہ اختیار کر رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو آپ وہ کر رہے ہیں جو میں انگلستان میں کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔" کچھ دن ادھر کی بات ہے کہ نیو ایجوکیشن فیلوشپ ڈیلیگیشن ہندوستان آیا تھا اس ڈیلیگیشن کے صدر مسٹر ایل زلیاکس کا بیان ہے کہ "جو اُصول اس جامعہ کے پیش نظر ہے اور عمل کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے اس کی بدولت یہ دنیا کی بہترین تعلیم گاہوں میں جو میں نے آج تک دیکھی یا سنی ہیں جگہ پانے کی مستحق ہے"

جامعہ میں "نصاب بنانے والوں کا ابتدائی تعلیم کے متعلق یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ اس کا مقصد محض بچہ کی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کی زندگی کو سنوارنا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ بچہ کی خداداد قوتوں میں نشو و نما کا سامان کرے، اور اس میں متمدن زندگی کے فرایض اور مقاصد سے لگاؤ پیدا کر دے۔ جہاں تک کہ ۵ سے ۱۲ سال تک کی عمر میں اس کا امکان ہے۔ اسے اپنی قوتوں پر، محرکات عمل پر، جذبات پر رفتہ رفتہ قابو حاصل ہونے لگے کہ اخلاقی اور ذہنی ضبط کی بنیاد اس سے پڑتی ہے اس میں اپنے فرض کا احساس پیدا ہو چلے، اور اس کو پورا کرنے کا ولولہ، اس کا تخیل اور اس کی ہمدردیاں اس طرح وسعت پذیر ہوں کہ وہ اپنے فطری اور معاشرتی ماحول میں اجنبی نہ رہے بلکہ اسے سمجھے اور ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ نصاب بنانے والوں کی آرزو ہے کہ جن بچوں کی تعلیم اس نصاب کے ماتحت ہو وہ تندرست ہوں اور ان کی چال ڈھال اچھی ہو۔ وہ لوگوں سے اچھی طرح صفائی اور فصاحت کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ ان کی گفتار میں حسن اور وقار ہو۔ وہ صاف ستھرے رہتے ہوں، سچ بولتے ہوں، آپس میں مل جل کر کام کر سکتے ہوں، کام کا جو منصوبہ بنائیں اسے ختم کو پہونچاتے ہوں اپنے ماحول کی حسن و خوبی سے لطف اندوز ہو سکتے ہوں اور اسے حسین اور خوب تر بنانے کی آرزو رکھتے ہوں۔ ہمدردی اور اخلاق کی بنیادیں ان کی ابتدائی زندگی میں ایسی استوار رکھی گئی ہوں کہ بڑے ہو کر یہ اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان یعنی پورے انسان ہوں"

میں تو اسوقت پانچ چھ سال کا بچہ تھا لیکن آپ میں سے اکثر نے وہ منظر دیکھا ہو گا یا اس کے حالات سنے ہوں گے جب چند "سرپھرے" نوجوانوں نے علیگڈھ میں چار قطاروں میں بیس خیمے لگا کر یہ اعلان کیا تھا کہ یہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" ہے اور اس کا کام مسلمان کو مسلمان اور انسان بنانا ہو گا، بعض لوگ ہنسے ہوں گے اور بعض خاموش رہے ہونگے

لیکن اس قلیل عرصے میں جامعہ اپنے نصب العین سے عملاً کس قدر معروف ہوچکی ہے

یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ قرول باغ میں گردوارہ روڈ پر شام کے وقت اکثر آپ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کچھ بچے دیکھینگے یہ بچے صاف ستھرے پن اور بھولے بھالے پن میں اس ماحول کے تمام بچوں سے مختلف ہوں گے۔ انھیں ذرا قریب سے دیکھئے ان میں سے ہر بچے کے دانت موتی کی طرح صاف ہوں گے، اس کے ناخون ترشے ہوئے ہوں گے اور گرد و غبار سے بچنے کے لئے اسکی جیب میں رومال ہوگا۔ آپ ان میں کسی بچے کو روکئے۔ بچہ بے خوف ہوکر رکیگا اور آپ سے کہیگا "فرمائیے" آپ اس سے کسی کا پتہ پوچھئے۔ وہ بہت احتیاط اور تفصیل کے ساتھ آپ کو پتہ بتادیگا اور اگر آپ نے ذرا پریشانی ظاہر کی تو یہ بچہ خود آپ کا راہبر بنجائیگا۔ آپ کو منزل تک پہونچائے گا، شگفتگی کے ساتھ "آداب عرض" کرے گا اور رخصت ہوجائے گا۔

——— یہ جامعہ کا بچہ ہے۔

جامعہ کے بچے سے اس سطحی تعارف کے بعد آیئے میں آپ کو اس کی زندگی سے اور زیادہ قریب لئے چلتا ہوں۔ شہر کی زہریلی ہوا سے دور، شہری زندگی کی خامکاریوں سے الگ اور مصنوعی تہذیب کی حدود سے باہر — اوکھلا میں جس جگہ ہماری موٹر رکتی ہے وہاں بائیں جانب ایک عالیشان دومنزلہ جرمن طرز کی سرخ عمارت نظر آئے گی۔ دور سے یہ عمارت قرب جوار کی ناہموار زمین پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے الٰہ دین کے چراغ والے جن نے کہیں سے اٹھاکر اسے یہاں لا رکھا ہے۔ لیکن یہ کسی ہندوستانی "چراغ الٰہ دین" کا محل نہیں ہے۔ یہ جامعہ کے بچوں کا گھر ہے۔ وہ گھر جہاں ہندوستان کے سوا دو سو بچے ہندوستان کی زندگی میں مردانہ وار حصہ لینے کے لئے تیار کئے جارہے ہیں وہ گھر، جہاں کے بچے پروان چڑھکر استبداد کی گردن پر پاؤں رکھیں گے وہ گھر جہاں کے رہنے والے دولت کی لعنت اور وراثتی کبر و خصومت کے گلے پر چھری چلائیں گے — کیونکہ ان کا مشرب ہے "جاگو اور جگاؤ"

جوہر منزل، حالی منزل، اقبال منزل، انصاری منزل، محمود منزل اور اجمل منزل — اس عمارت میں چھ اقامت گاہیں ہیں۔ آپ ان ناموں سے سمجھ سکتے ہیں کہ جامعہ ابتدا ہی سے بچہ میں کس حد تک اپنے قومی ورثے کو صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی عادت ڈالتی ہے۔ آیئے اب ذرا ایک اقامت گاہ میں چلیں۔ دیکھئے ان بچوں کے بستر کس سلیقے سے لگے ہوئے ہیں۔ بستروں کے درمیان ہر جگہ ایک سا فاصلہ ہے۔ گویا کل کمرے کی پیمائش کرکے بستروں کی جگہ قایم کی ہے۔ یہ کمرے کے پیچھے دیکھئے انکے استعمال کے کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں اور یہیں ایک قطار میں سب کے جوتے رکھے ہوئے ہیں کونے میں دیکھئے پینے کا پانی ایک گھڑے میں رکھا ہے۔ صفائی کے لئے گھڑے میں ہو سکھم ہوک لگا ہوا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر جو تصویریں لگی ہوئی ہیں وہ اسی کمرے کے رہنے والوں کی تخیل کی ترجمان ہیں۔ یہاں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بچے کے فطری رجحانات اور ذوق و شوق کی پذیرائی کے کیا مواقع ہیں — یہ بچے منھ اندھیرے اٹھتے ہیں۔ ضروریات سے فارغ ہوکر پون گھنٹہ کھلی ہوا میں ورزش کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک بڑے خاندان کی طرح ایک ساتھ بیٹھکر ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرتے ہیں۔ جس نفاست کے ساتھ یہ بچے ناشتہ کرتے ہیں وہ آپ کو

دوسری جگہ کے بڑے طلبہ میں بھی کم نظر آئے گی۔ ڈائننگ ہال میں انتظام کرنے کے لئے ہر ماہ ہر جماعت اپنے دو نمایندے منتخب کرکے بھیجتی ہے جو ڈائننگ ہال میں کھانے کے وقت اپنی اپنی جماعت کی ضروریات پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ناشتے کے بعد سب بچے ترانے کے لئے جمع ہوتے ہیں اور اُس وقت جب اس عمارت کے ایک گوشے سے دو سو معصوم آوازیں

ہاتھ اُٹھائے، سر کو جھکائے

رحم پہ تیرے آس لگائے

گاتی ہوئی اُٹھتی ہیں تو دل کی رگ رگ میں ایک گونج پیدا ہو جاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے تو یقیناً انسان اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہتا۔ "ترانے" کے بعد دن کے ضروری اعلانات ہوتے ہیں پھر کل کی کھوئی ہوئی چیزیں جن میں جوتے، ٹوپیاں تولیاں، چاقو، ربر، پنسلیں سب ہی کچھ ہوتا ہے بچوں کو واپس کردی جاتی ہیں اور پھر مدرسہ شروع ہوتا ہے۔

درجے میں بھی یہ بچے اپنے بچپن سے دور اور زندگی سے الگ نہیں ہونے پاتے بلکہ یوں کہئے کہ زندگی ہی ان کے لئے ذریعۂ تعلیم ہے۔ چنانچہ جامعہ کا بچہ زبان سیکھتا ہے، اس لئے نہیں کہ اسے زبان کا امتحان دینا ہے بلکہ اس لئے کہ اسے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حساب سیکھتا ہے اس لئے نہیں کہ حساب اسکے نصاب میں شامل ہے بلکہ اس لئے کہ اسے اپنے چڑیا خانہ، بچوں کی دوکان اور بینک کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ وہ سائنس پڑھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ سائنس کے کچھ اُصول رٹ کر اچھے نمبر حاصل کرسکتا ہے بلکہ اس لئے کہ اگر اس سے کبھی (Swan ink) کی شیشی نہ کھلے تو وہ ایک دیا سلائی سے اس کا ڈھکن گرم کرکے اسے کھول سکے۔ وہ سماجی علم پڑھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ریل کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر دوسرے مسافروں کو دھکا دے، بلکہ اس لئے کہ خود بھی آرام سے سفر کرے اور دوسروں کو بھی آرام سے سفر کرنے دے۔ وہ مذہبی تعلیم بھی حاصل کرتا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ افیونی بن کر جنت وجہنم کے خواب دیکھنے میں اپنا وقت ضایع کرے بلکہ اس لئے کہ وہ دوسروں کی مصیبت میں خدا کا ہاتھ بن کر کام آئے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ کا بچہ زندگی اور دنیا سے کبھی نہیں گھبراتا۔ وہ سماج میں اپنی جگہ پہچانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا سماج پر اور سماج کا اس پر کیا حق ہے۔

دوپہر کو کھانے بعد یہ بچے کچھ آرام کرتے ہیں۔ شام کو ان کے لئے ہر قسم کے کھیل کا انتظام ہے۔ زیادہ چھوٹے بچوں کے لئے جھولے اور سلائڈ موجود ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد ریڈیو پر کچھ دیر گانا اور خبریں سنتے ہیں۔ پھر وقت پر سو جاتے ہیں۔

ان کھیلوں اور دلچسپیوں کے علاوہ جن کا مدرسے کی طرف سے انتظام ہے بچوں کی اپنی نجی دلچسپیاں بھی ہیں بینک بھلوں کی دوکان، کتابوں کی دوکان اور چڑیا گھر کے انتظامات کے علاوہ ایک پندرہ روزہ "بچوں کا اخبار" بھی ان کا نجی معاملہ ہے۔ اس اخبار کے "عید نمبر" اور "دیوالی نمبر" بہت دلچسپ تھے اور اشتہاروں کے ذریعے باضابطہ طور پر ان نمبروں کا پروپاگنڈا کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف بچے اپنے لئے ایک موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ تصاویر اور معلومات البم کی صورت میں جمع کرتے ہیں۔ ایک بچے نے، جس کا نام مجھے اسوقت یاد نہیں آرہا ہے، بچوں ہی کی تصاویر کا ایک البم بنایا ہے

مجھے یہ البم سب سے زیادہ پسند ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس بچے کو اپنا بچپن کس قدر عزیز ہے! پتیاں، کیڑے مکوڑے، ٹکٹ اور سکے جمع کرنے کا شوق تو عام ہے۔ ان دلچسپیوں کے علاوہ ہر جماعت کی ایک یونین ہے جس میں باقاعدہ مختلف کاموں کے لئے وزیروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہر ہفتے یونین کا ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں بعض مفید باتوں پر تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔

آئیے، اب میں اپنے چند دوستوں سے آپ کی ملاقات کراؤں۔ دیکھئے یہ ایک چھوٹا سا بچہ جو اپنی اونی ٹوپی اور گرم کوٹ میں اسکیمو معلوم ہو رہا ہے درجہ دوم کا طالبعلم ہے۔ اس کی عمر سات آٹھ سال کی ہوگی اور اس کا نام قاضی اسرار ہے۔ جامعہ میں میری دوستی سب سے پہلے اسی بچے سے ہوئی تھی۔ اسے کہانیوں کا بیحد شوق ہے۔ ایک دن سحر گشت کے سلسلہ میں اس نے مجھے یہاں سے نہر تک چار کہانیاں سنا ڈالیں۔ اس کا ہمیشہ تقاضا ہوتا ہے کہ میں اس کے ساتھ ساتھ چلوں۔ میری انگلی پکڑ لیتا ہے اور ساتھ رہنے کے شوق میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھاگتا ہو حتیٰ کہ اس کی سانس پھول جاتی ہے۔ پھر میں اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں ایک اور بچہ دیکھئے۔ اس کا نام رضوان ہے۔ چہرہ کیسا گول گول ہے، آنکھیں کسقدر روشن۔ ہر بات سے بھولا پن برستا ہو گویا معصومیت کا دیوتا ہے۔ ورڈسورتھ نے ایسے ہی کسی بچے کے قدموں میں آسمان دیکھا ہوگا۔ اسے بھی میری گود میں چڑھکر مجھ سے باتیں کرنے کا اور میری انگلی پکڑکر چلنے کا بہت شوق ہے۔ اور ہاں وہ ایک بچہ بھی جس نے ہمیں دور سے سلام کیا، عجیب بچہ ہے۔ ذہانت اسکے چہرہ سے برستی ہے، گو لکھنے پڑھنے میں زیادہ تیز نہیں ہے۔ جب میں سب سے پہلی مرتبہ ڈائننگ ہال آیا تو انھوں ہی نے "السلام علیکم" کے ساتھ میرا استقبال کیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ "آپ کس سیاسی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں؟" تو میں کہ سیاست کو سیاست کی طرح سمجھنے کا عادی ہی نہیں، ذرا گھبرا سا گیا۔ اپنی ندامت چھپانے بھی اس لئے خاموش رہا۔ لیکن انھوں نے پھر نئے شوق کے ساتھ مجھ سے کہا "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" "میں کسی سیاسی ادارے سے تعلق نہیں رکھتا۔" میرا جواب تھا۔ اس پر اس بچہ نے تیور بگاڑ کر مجھ سے کہا "واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں سیاسی ادارے سے تعلق نہیں رکھتا، ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں مختلف چیزیں انتخاب کرنی ہوتی ہیں۔ اسلئے کوئی سیاسی ادارہ بھی آپ کا پسندیدہ ضرور ہونا چاہیئے۔" جامعہ میں یہ میرا پہلا سبق تھا جو ایک بچہ سے مجھے ملا۔ یہ ملاقات تو یہیں ختم ہوگئی لیکن اپنی اولین فرصت میں ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کی، چائے پی بھیل کھائے اور ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ ان کا نام مصطفےٰ رشید صدیقی ہے۔ درجہ ششم میں تعلیم پاتے ہیں اور چڑیا گھر کے ناظم ہیں۔ ۔ وہ ایک صاحب جو ابھی ابھی نظر بچا کر ادھر سے نکل گئے منیر الدین قادری ہیں خدا نے ذوق اور ذہن دونوں دئے ہیں مدرسہ کے بہترین مصور ہیں۔ ہم دونوں کو ایک تعلیمی سفر کے سلسلہ میں قریب دو ہفتے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھنے کی بات یہ تھی کہ کس حد تک جامعہ اپنی تربیت کے اثرات بچوں کے ذہن میں مستقل طور پر قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ میں روز اس بات کی تلاش میں رہتا تھا کہ دیکھوں منیر جامعہ کے اصولوں سے کس جگہ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن میری جستجو فضول تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ جامعہ کا بچہ ہر جگہ اپنی جامعہ بنا لیتا ہے۔ منیر کو اس کمسنی میں زبان پر متحیر کن قابو اور قدرت حاصل ہے سفر میں

میرے سامنے بیٹھ کر اپنی ڈائری کے صفحے کے صفحے بغیر تکان لکھے چلے جاتے تھے اور مضمون کے تسلسل میں سرِ مو فرق نہیں آتا تھا۔ "بچوں کا اخبار" انھیں کی زیرِ ادارت نکلتا ہے - عبداللہ نعیم اور محمود سے آپ کی ملاقات اور کراتا لیکن وہ اسوقت کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ جامعی بھائیوں میں یہ بھی مجھے بہت عزیز ہیں۔

یہ تو چند وہ ستارے تھے جن سے میں نے اپنا آفتاب بنانے کی کوشش کی تھی۔ اب آپ پھر ایکبار مجموعی حیثیت سے جامعہ کے بچوں کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ دوسرے مدرسوں میں تعلیم پائے ہوئے بچوں سے کس قدر مختلف ہیں۔ سب سے بڑی بات جامعہ کے بچوں میں یہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ اُستاد موجود ہو یا نہ ہو لیکن اسے اپنے کام میں لگے رہنا۔ اسکے علاوہ جامعہ کا بچہ آزاد ہندوستانی کی حیثیت سے رہنا پسند کرتا ہے اسلئے اسکے نزدیک سماجی امتیازات اور پابندیاں لایعنی سی چیزیں ہیں اور وہ آن بان جسے کرائے کی آن بان کہئے اسکے یہاں حرام ہے۔ یہ بچہ غریب گھر کا ہو یا امیر لیکن صاف رہنے کے لئے خود ہی اپنے جوتے پر پالش کر لیتا ہے اور خود ہی کپڑے بھی دھو لیتا ہے۔ جامعہ کا بچہ وقت کی پوری قدر کرتا ہے۔ چنانچہ جب اس کا کسی کام میں جی نہیں لگتا تو وہ دوسروں کے پاس جا کر ان کا وقت برباد نہیں کرتا لیکن اس گفتگو کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جامعہ کا بچہ عمر سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہرگز نہیں جب موقع ہوتا ہے تو یہ شور کرتا ہے اور خوب شور کرتا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے لڑ بھی لیتا ہے اور پھر جواب میں پٹ لینے پر روتا بھی ہے — ملک اور قوم کے بچوں کی اس خدمت کے باوجود کچھ لوگ جامعہ سے خفا ہیں اور وہ اس لئے کہ جامعہ انکے بچوں کی تربیت کا ذمہ نہ لے سکی۔ ہمارے ان بزرگوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو جامعہ بھیجنے کے شوق کے ساتھ ساتھ جامعہ کی مجبوریوں کو بھی مدِ نظر رکھیں۔ جامعہ ایک اقامتی درسگاہ ہے اور اسے اپنا طریقۂ تعلیم کامیاب بنانے کے لئے دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر ضرورت سے زیادہ کمزور کسی بچے کو یا کسی ایسے بچے کو جو بہ لحاظ عمر صحیح ذہنی استعداد حاصل نہیں کر سکا ہے داخل نہ کرے۔ جامعہ کا یہ رویہ والدین کے لئے ناگوار ہو تو ہو لیکن جامعہ والدین کو خوش کرنے کے لئے بچہ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ کچھ اسی قسم کی غلط فہمیوں سے متاثر ہو کر بعض احباب نے جامعہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اپنا "شغلِ فرصت" بنا رکھا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ۲ نومبر ۳۹ء کو میں نے بمبئی میں مکتبۂ جامعہ کی شاخ کے قریب دیوار پر یہ اشتہار لگا دیکھا "جامعہ کی کتب بائیکاٹ کرو۔ جامعہ بچوں کو مدینہ کی بجائے کاشی کا راستہ دکھاتی ہے۔ نیا قاعدہ صفحہ ۲۹" یہ اشتہار دیکھ چکنے کے بعد میں نے اپنی سب سے پہلی فرصت میں نیا قاعدہ دیکھا صفحہ ۲۹ پر کچھ یہ جملے تھے، یاد داشت سے نقل کرتا ہوں - "ریل میں بیٹھ۔ سفر کر۔ متھرا جا۔ پیڑے لا" آپ خود سوچئے کہ کیا یہی کاشی کی راہ دکھانا ہے؟ پھر ان معترضین کو اگر تعلیم سے ذرا بھی لگاؤ ہوتا تو جانتے کہ ہندوستانی بچے کے لئے "متھرا اور متھرا کے پیڑے زیادہ قریب کی چیزیں ہیں نہ کہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ" - یہ اُصول کہ بچے کے لئے تعلیمی مواد بچے ہی کے ماحول سے لینا چاہئے اب اتنا نیا بھی نہیں ہے کہ بمبئی کے مسلمان اسے نہ جانتے ہوں لیکن جس قوم کے متعلق قدرت یہ فیصلہ کر چکی ہو کہ اسے مٹنا ہے اس کے لئے کوئی انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ جامعہ کا اگر کوئی قصور اور کفر ہے تو صرف اتنا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک بیدار قوم بنا کر ہندوستان میں امن و سکون کے ساتھ رہنا سکھاتی ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان کو ہندوستان میں رہنا ہی کب ہے۔ اسے تو افغانستان، ایران، عرب، فلسطین ترکستان اور مصر میں جا کر ان آزاد مسلمانوں کی حمایت میں کٹ مرنا ہے جنھیں اس غلام مسلمان کی ضرورت نہیں یا ہندوستان میں سرائے کے ایک مسافر کی طرح زندگی کے دن پورے کر کے آسمان کا رخ کرنا ہے — جامعہ آپ کو تعجب ہوگا روپے سے نہیں بنی ہے۔ اسکی بنیادیں ایثار اور خلوص پر رکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ان بے شمار دشواریوں کے جو اس قسم کے اداروں کے سامنے آتی ہیں جامعہ روز بروز اپنے نصب العین سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ جامعہ کی مسلسل ترقی کا ایک ثبوت "اُستادوں کا مدرسہ" بھی ہے۔ "اُستادوں کا مدرسہ" امسال اپنی زندگی کا دوسرا سال پورا کر رہا ہے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جس اُستادوں کے مدرسے کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور پروفیسر سعید انصاری صاحب جیسے اُستادوں کی سعی و کاوش وابستہ ہوں اسے جدید تعلیمی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے کس معیار کے اُستاد تیار کرنے چاہئیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس ادارے کو بھی اپنی نوخیزی کے باعث بعض سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جامعہ کا یہ ادارہ بھی اپنے ہمشیر اداروں کی طرح ہندوستان کے چوٹی کے ماہرینِ تعلیم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے — اور یہ سب خلوص کا کرشمہ اور ایثار کا معجزہ ہے۔ اسی بھروسہ پر جامعہ کا کام چلا ہے اور چلیگا۔

فضل الدین اختر ایم - اے

باب الاستفسار

موجودہ جنگ کا نتیجہ

(جناب سید اسماعیل حسن صاحب - ناگپور)

آپ کے جو مقالے جنگ کے متعلق نگار میں شایع ہوتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سیاسیات عالم کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے، لیکن ہمیں تو آپ صاف صاف الفاظ میں یہ بتائیے کہ موجودہ جنگ کا کیا نتیجہ ہوگا، آیندہ یہ کیا صورت اختیار کرنے والی ہے اور ہم لوگ کب تک اس مصیبت میں بتلا رہیں گے۔

(نگار) آپ ایسے مسئلہ میں مجھ سے پیشین گوئی کی درخواست کرتے ہیں کہ اگر آج کوئی نبی ہوتا، تو شاید وہ بھی اسکی جرأت نہ کر سکتا۔ بڑے بڑے انبیا نے متعدد لڑائیاں لڑی ہیں، لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فیصلہ ہمیشہ ان کے موافق ہوا ہے، اگر انھیں نتیجہ کا علم ہوتا تو وہ کیوں لڑتے اور کیوں انھیں شکست ہوتی۔

تاہم حالات کی بنا پر یہ ضرور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی موجودہ حکومتوں کے نظام پر اس کا بڑا زبردست اثر پڑے گا اور ہو سکتا ہے کہ یا تو عالم میں ایک مستقل امن و سکون کی صورت پیدا ہو جائے، یا اس سے بھی زیادہ ہولناک جنگ کے اسباب رونما ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ فرانس و برطانیہ کا عملی اتحاد اور امریکہ وغیرہ دوسری جمہوری حکومتوں کی اخلاقی ہمدردی - یہ اتنا زبردست محاذ ہے کہ جرمنی و روس کا باہمی تعاون اس کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، لیکن میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ آگے چل کر جمہوری حکومتوں کے مقابلہ میں لڑائی کا سارا بوجھ انھیں دو کے سر پڑ جائے گا اور یوروپ و ایشیا کی کوئی اور حکومت ان کا ساتھ نہ دے گی۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نے تین سال تک لڑنے کا ارادہ تو کر ہی لیا ہے۔ لیکن برنارڈ شا کے خیال کے مطابق اس میں ایک صفر اور بڑھانا چاہئے۔ جرمنی کی طیاریوں کا صحیح علم ہمیں حاصل نہیں، لیکن اگر

اس کے بیانات سے مبالغہ کا حصہ علیحدہ کر دیا جائے تو بھی وہ کم از کم ایک سال تو آسانی سے مقابلہ کر ہی سکتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس دوران میں بعض گتھیاں ایسی نہ پڑیں کہ ان سے وہ جائز یا ناجائز فائدہ اُٹھا کر اور کئی سال تک اس آگ کو مشتعل نہ رکھ سکے۔

میں نے اس اشاعت کے ملاحظات میں زیادہ تفصیل کے ساتھ جنگ کے مستقبل پر بحث کی ہے، آپ اسے پڑھئے اور پھر بھی اگر کوئی بات آپ کو تشنہ نظر آئے تو مجھ سے دریافت فرمائیے۔ بہرحال آپ اور ہم سب کو نہایت سخت مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار رہنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہم نے اس موقعہ کو محض توکل بخدا ایک بیکسانہ خاموشی کے ساتھ گزر جانے دیا تو پھر اس کے بعد جو دور ہندوستان پر آئے گا وہ ایک لازوال غلامی کا ہوگا اور اس سے صدیوں تک نجات ملنا مشکل ہے۔

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب تفضل حسین صاحب - رانچی)

معلوم نہیں اس سے پہلے جن حضرات نے استفسار کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا، وہ آئندہ اس کو جاری رکھیں گے یا نہیں، لیکن اس خیال سے کہ مبادا وہ خاموش ہو گئے ہوں اور یہ سلسلہ منقطع ہو جائے، میں ذیل کے اشعار کا مفہوم دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

۱- غیر کو سینہ کہے سے سیمبر دکھلا دیا — تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا

پہلا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے - کیا سیمبر اس جگہ منادیٰ ہے۔ دکھلا دیا کا فاعل کیا ہے

۲- دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا — اس بت پردہ نشیں نے جلوہ گر دکھلا دیا

ایمان بالغیب سے کیا مراد ہے اور اس کا تعلق کس سے ہے؟

۳- دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب، — تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

طالع ناساز اگر خود مومن کا تھا تو وہ اس کے حق میں سازگار کیونکر ہو گیا۔

۴- مت رکھیو گردِ نازکِ عشاق پر قدم — پامال ہو نہ جائے سر افراز دیکھنا

۵- گور میں بھی جوشِ غم دل سے نہ نکلا ہائے ہائے — آپ ہی میں ہم نہیں جب کنج تنہائی ملا

۶- ہم بھی تو ناداں ہیں آخر یاسِ مطلب کس لئے — خضر، موسیٰ کو پئے تعلیم دانائی ملا

۷- جستجو سے وصلِ دلبر کی تمنا کس لئے — کیا دلِ گم گشتہ اسے ہنگام آرائی ملا

۸- واعظ بتوں کو خلد میں لیجائیں گے کہیں — ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

۹- ہے ظلم کرم جتنا تھا فرق پڑا کتنا
مشکل ہے مزاج اتنا اک بار بدل جانا

۱۰- کیا باتیں بناتا ہے وہ جان جلاتا ہے
پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا

۱۱- مطلب ہے کہ وصلت میں ہو بوالہوس آفت میں
اس گرمیِ صحبت میں اے دل نہ پگھل جانا

۱۲- محوِ جفا ستم کشِ الطاف کب ہوا
رحم اُس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا

۱۳- کس دن بھی اسکے دل میں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

۱۴- جی طعنِ وصلِ حور سے کیسا جلا دیا
روزِ جزا کا ذکر جو محفل میں شب ہوا

۱۵- ازبس کہ تھی وصال میں غیروں سے ہمسری
عیش و سرور باعثِ رنج و تعب ہوا

۱۶- تاثیر بیقراریِ ناکام آفریں
ہے کام ان سے شوخ شمایل کو تھامنا

۱۷- دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے
اے چرخ اپنے تو مہ کامل کو تھامنا

۱۸- مضطر ہوں کس کا طرزِ سخن سے سمجھ گیا
اب ذکر کیا ہے سامعِ عاقل کو تھامنا

۱۹- سیکھے ہیں مجھ سے نالۂ نہ آسماں شکن
صیاد اب قفس میں عنادل کو تھامنا

۲۰- یہ زلف خم بخم نہ ہو، کیا تاب غیر ہے
تیرے جنوں زدہ کی سلاسل کو تھامنا

۲۱- مت مانگیو امان بتوں سے کہ ہے حرام
مومن، زبان بیہدہ سائل کو تھامنا

۲۲- تھی کمیں میں غارتِ بوسِ دہن ہنگام خواب
شب کی بیداری سحر کا خواب رہزن ہو گیا

۲۳- زخم تو بھی مرہم زخم کُہنہ ہے چارہ گر
بند تیرِ یار سے سینہ کا روزن ہو گیا

۲۴- رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا
کیا ایک بھی ہمارا خطِ یار تک نہ پہونچا

(نگار) مومن کے اشعار سمجھنے کے لئے سب سے پہلے آپ ان کی نثر کر لیا کیجئے، بہت سے اشعار تو اسی طرح حل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو، تو پھر یہ غور کیا کیجئے کہ شعر میں محذوفات کیا کیا ہیں اور اگر کوئی خاص فارسی ترکیب ہو تو اس کے مفہوم اور محل استعمال کو بھی دیکھئے۔ آپ نے جتنے اشعار درج کئے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو نثر کرنے کے بعد سمجھ میں آسکتے ہیں۔ بعض البتہ زیادہ دقیق ہیں ۔ بہرحال اب سلسلہ وار انکا مطلب سنئے:-

۱- پہلے مصرعہ کی نثر یوں ہوئی :- سیمبر کہنے سے غیر کو سینہ دکھلا دیا۔ یعنی غیر نے جو تمہیں سیمبر کہا تو فوراً فخر و غرور سے سینہ دکھا دیا۔ دوسرا مصرعہ صاف ہے۔ سیمبر یہاں منادیٰ نہیں ہے، دونوں مصرعوں میں دکھلا دیا کا فاعل تم نے ہے جس سے دوسرا مصرعہ شروع ہوتا ہے۔

۲- ایمان بالغیب سے مراد خدا پر بے دیکھے ایمان لانا ہے، جو مومن کی صفت ہے۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ اے مومن

یہ تمہارا ایمان بالغیب اسی وقت تک ہے جب تک اس بت پردہ نشیں نے جلوہ نہیں دکھایا۔ یعنی اس کا جلوہ دیکھتے ہی خدا کو نہ بھول جاؤ تو سہی!

۳- دوسرے مصرعہ کی نثر محذوفات پُر کرنے کے بعد یوں ہوگی:-
منجم کے لئے میرا طالعِ ناساز دیکھنا، اس کے لئے ساز گار تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب منجم نے میرے حالِ زار کو دیکھا تو اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس پر یہ جان دیتا ہے وہ واقعی بہت جمیل ہے اور اس طرح وہ میرا رقیب بن گیا۔ گویا میرا طالعِ ناساز دیکھنا ہی اسے ساز گار ہوگیا۔

۴- عاشقوں کی سروں کی خاک پر قدم نہ رکھنا ورنہ ان کے لئے یہ بات سرافرازی کا باعث ہوجائے گی اور یہ تم چاہتے نہیں کہ جو تمہارا پامال ہو وہ سرافراز ہوجائے۔

۵- جب تک زندہ رہے دنیا کے ہنگامہ کی وجہ سے دل کی بھڑاس نہ نکلی۔ گور میں بیشک تنہائی ملی تھی اور موقعہ تھا کہ خوب دل بھر کر رو لیتے، لیکن افسوس ہے کہ یہاں خود ہمیں اپنا ہوش نہیں۔

۶- اس شعر میں تلمیح ہے موسیٰ و خضر کے ملاقات کی۔ مشہور روایت ہے کہ موسیٰ کو بعض باتیں معلوم نہ تھیں اور ان کو ہدایت ہوئی تھی کہ وہ خضر سے ملکر دریافت کریں۔ اسی پر قیاس کرکے شاعر کہتا ہے کہ میں بھی تو موسیٰ کیطرح نادان ہوں اس لئے مطلب کی طرف سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ ممکن ہے مجھے بھی میرا خضر (محبوب) مل جائے۔

۷- اے ہنگامہ آرائی، کیا دلِ گم گشتہ تجھے مل گیا تھا جو اب ہنگامہ جستجو سے وصلِ دلبر کی تمنا کرتی ہے؟ یعنی جس طرح ہنگامہ آرائی سے دلِ گم گشتہ نہیں مل سکا، اسی طرح وصلِ دلبر بھی میسر نہیں آسکتا، مدعا یہ کہ سب مقدر پر منحصر ہے، کوشش سے کچھ نہیں ہوسکتا۔

۸- یہ شعر نازک ہے۔ واعظ پر طعن کرتا ہے کہ اگر تیرے کہنے کے مطابق کافروں کو عذابِ جہنم میں مبتلا کیا جائے گا۔ تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ بتوں کو جہنم سے نکال کر خلد میں لیجائیں گے۔ ورنہ اگر بُت بھی جہنم میں رہے تو کافروں کیلئے جہنم بھی بہشت ہوجائے گا۔

۹- کتنا فرق پڑ گیا کہ پہلے جتنا کرم تھا اتنا ہی ظلم ہے۔ دفعتاً کسی کا مزاج اتنا بدل جانا بہت مشکل ہے۔

۱۰-۱۱- یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں اُس سے سوالِ وصل کرتا ہوں تو وہ پانی پر کافور جلا کر دکھاتا ہے یعنی دیکھو بوالہوس یا غیر کا حال وصل میں اسی کافور کی طرح ہوتا ہے، سوائے دل تو ان باتوں میں آکر سوالِ وصل سے ہٹ نہ جانا، وہ تو یونہی باتیں بنایا کرتا ہے۔

۱۲- محو جفا (یعنی میں) کب اس کے الطاف کا متکش ہوا تھا، یعنی میں اس سے واقف ہی نہیں کہ اسکی عنایتیں کتنا بڑا ظلم ہیں، اس لئے اس کا اب میرے حال پر رحم کرنا قیامت ہے۔ کیونکہ اس نوع کی ستم رانیوں سے متحمل ہونیکا

موقعہ مجھے کبھی ملا ہی نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ میں انھیں برداشت نہ کر سکوں۔

۱۲- یہ شعر خاص مومن کے رنگ کا ہے۔ محبوب، عدو سے اس لئے خفا ہے کہ اس کی محبت کا یقین نہیں رہا۔ مومن یہ رنگ دیکھ کر محبوب سے کہتا ہے کہ عدو کو تم سے پہلے ہی کب محبت تھی جواب نہیں رہی۔ اس لئے تمھارا اُس سے ناخوش ہونا بے سبب ہے۔

۱۳- روزِ جزا کے ذکر پر محبوب نے طعن کیا کہ تمھیں تو وہاں حوریں ملیں گی، پھر کیا فکر ہے۔ اس طعن کو سن کر مومن کہتا ہے کہ میرا جی کیا کیا جلا ہے۔

۱۵- مجھے وصل تو نصیب ہوا لیکن اس خیال سے کہ یہ تو صرف غیروں کی برابری ہوئی، سارا عیش خاک میں ملگیا۔

۱۶- اس شعر میں آفریں کا لفظ دھوکا دیتا ہے اور لوگ اسے ناکام کے ساتھ متعلق سمجھکر کوئی فارسی ترکیب قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ آفریں یہاں بالکل علٰحدہ ہے اور شاباش کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اپنی بیقراریِ ناکام سے طنزیہ لہجہ میں مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ شاباش، تو نے خوب اپنا اثر دکھایا یعنی بجائے اس کے کہ تو اس کو بیقرار کر دیتی، تو نے اس میں اور سکون پیدا کر دیا، سچ ہے ایسے شوخ شمایل کو تھامنا بھی آسان کام نہ تھا۔

۱۷- وہ (محبوب) چاندنی کی طرف دیکھ رہا ہے، اس لئے اے آسمان اپنے مہر کامل کو سنبھالنا کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین پر آ رہے

۱۸- سامع عاقل میری باتوں سے سمجھ گیا کہ میں کس کے لئے بیتاب ہوں، اسلئے اب اس کو سنبھالنا مشکل ہے۔

۱۹- "نالۂ آسماں شکن" - یعنی وہ نالہ جو نو آسمانوں کو توڑ کر نکل جائے۔

۲۰- یہ محبوب کی زلف خم بہ خم نہیں کہ غیر سنبھال لے، بلکہ تیرے دیوانوں کی زنجیر ہے۔

۲۱- "زبانِ بیہدہ سائل" یعنی وہ زبان جو بے معنی سوال کرے۔ اے مومن اپنی بے معنی سوال کرنے والی زبان کو تھام۔ بتوں سے پناہ مانگنا حرام ہے۔

۲۲- یہ شعر مومن کا بہت اُلجھا ہوا ہے اور وہ معنے جو اس کے بیان کئے جاتے ہیں سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر پہلے مصرعہ میں خواب کو وصل کے معنے میں لیا جائے اور دوسرے مصرعہ میں "شب کی بیداری" کے آگے "کے بعد" محذوف مانا جائے تو یہ معنے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وصل کی شب بوسۂ دہن لینے کی خواہش گھات میں تھی لیکن یہ رہزنی اس وقت پوری ہوئی جب رات بھر جاگنے کے بعد صبح کے وقت معشوق سو گیا۔

۲۳- پہلے یار نے تیر چلایا تو زخم ہو گیا لیکن جب دوبارہ چلایا تو تیر اس زخم میں رہگیا اور اس کا روزن بند ہو گیا اسکو وہ مرہم زخم سے تعبیر کرتا ہے۔

۲۴- محبوب کی عادت ہے کہ وہ ہر بات غیروں سے کہدیتا ہے۔ اس لئے اگر میرا رازِ نہاں آشکارا نہیں ہوا تو شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا کوئی خط محبوب تک نہیں پہونچا، ورنہ وہ یقیناً غیروں سے ذکر کرتا۔

تنوعات

کرسیوں وغیرہ پر جس چیز سے وارنش کی جاتی ہے اسے لاکھ کہتے ہیں لاکھ میں ایک کیڑا ہے جو درختوں کی شاخوں میں لگ جاتا ہے اور اسی کو ہلاک کرکے وارنش طیار کی جاتی ہے، لیکن شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ جب ۵۰۰۰ ایکڑوں کا خون ہوتا ہے جب کہیں جاکر ایک پونڈ لاکھ ہاتھ آتی ہے —— چیونٹی کی ایک قسم ہے جو بارش کے وقت پنکھڑیوں کا پتیوں کی چھتری اپنے سر پر لیکر چلتی ہے —— سمندر میں آپ ایک جہاز سے زیادہ از زیادہ دس میل دور کی چیز دیکھ سکتے ہیں۔ —— ہر درجۂ حرارت کے اضافہ کے ساتھ آواز کی رفتار فی سکنڈ ایک فٹ بڑھجاتی ہے —— چونکہ جاپانی موٹے آدمیوں کو پسند نہیں کرتے اس لئے وہاں دوسرے ملکوں کے جتنے سفیر بھیجے جاتے ہیں وہ سب دبلے پتلے ہوتے ہیں —— روم کے پاپائے اعظم کی ڈاک کا جواب دینے کے لئے ۳۵ سکرٹری مقرر ہیں —— کلیفورنیا کی ایک بستی میں جہاں زیادہ تر معدنوں میں کام کرنے والے رہتے ہیں ایک ہوٹل کے دروازہ پر یہ نوٹس لگا ہوا ہے کہ "اگر تمھیں ہمارے یہاں کا بھنا ہوا گوشت سخت معلوم ہوتا ہے تو ہوٹل سے نکل جاؤ، یہ کمزور آدمیوں کی جگہ نہیں ہے" —— یوگوسلیویا میں ایک مقام ہے جس کا نام وروٹنکا ہے، یہاں کی مقامی حکومت نے قسم کھانا ممنوع قرار دیدیا ہے۔ جو شخص پہلی مرتبہ اس جرم کا مرتکب ہوتا ہے اسے تنبیہ کردیجاتی ہے، لیکن دوسری بار اس جرم کے ارتکاب میں اسکو جھاڑو لیکر سڑکیں صاف کرنے کی سزا دیجاتی ہے —— دنیا میں کوئی دو تیتریاں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں —— انسان کے اعصاب بالائی حصۂ جسم پر ہوتے ہیں اور کیڑوں کے اعصاب اندر ہوتے ہیں —— انگریزی زبان میں ۵ لاکھ لفظ پائے جاتے ہیں جن میں سے شکسپیر نے ۲۴ ہزار استعمال کئے اور ۵ ہزار ایسے جنھیں مکرر استعمال نہیں کیا۔ ملٹن نے ۷ ہزار الفاظ استعمال کئے اور انجیل میں صرف ۶۰۰۰ الفاظ استعمال ہوئے ہیں —— ستر سال کی عمر میں ساڑھے چار سال انتظار میں ختم ہوتے ہیں اور تین سال نہانے دھونے میں —— اسوقت دنیا میں ۷ لاکھ ۵۰ ہزار کیڑے دریافت ہوئے ہیں جو انسان کی غذائی پیداوار کا دسواں حصہ ہضم کرجاتے ہیں —— جرمنی میں اب ایک دایرہ بجائے ۳۶۰ ڈگری کے ۴۰۰ ڈگریوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اس لئے وہاں کا زاویۂ قائمہ بجائے ۹۰ ڈگری کے ۱۰۰ ڈگری کا ہے —— دودھ پلانے والے جانوروں میں سب سے کم عمر چوہے کی ہے یعنی دو یا تین سال —— یوروپ میں سب سے زیادہ اوسط پیدایش روم کا ہے یعنی ۴ء۲۲ فی ہزار۔ —— جلی فش (ایک قسم کی مچھلی) کی ساخت میں ۹۰ فی صدی حصہ پانی کا ہے —— بارش کے قطروں کو کبھی کبھی ایک گھنٹہ زمین تک پہونچنے کے لئے درکار ہوتا ہے —— سیام کے امراء کی نہایت مرغوب غذا سانپ کا اچار ہے جو سرکہ سے بنایا جاتا ہے —— انسانی زبان میں ذائقہ کے ۳۰۰۰ ہزار خلایا پائے جاتے ہیں، گائے کی زبان میں پندرہ ہزار اور ہرن کی زبان میں ۵۰ ہزار۔

معراجِ محبت

(سرمست تمکین حیدر آبادی)

تمناؤں سے حسن و عشق کی گودوں میں پلتے تھے
رہِ ہستی کی ہر منزل میں جادو بن کے چلتے تھے

نگاہوں کی طلب دل کا تقاضا بنکے رہتے تھے
نہ جانے اور ہم آپس میں کیا کیا بنکے رہتے تھے

ہمیں امکان کی حد سے گزر جانا بھی آتا تھا
سما کر آنکھوں میں دل میں اُتر جانا بھی آتا تھا

تمناؤں کا ہو جاتا تھا سودا آنکھوں میں
اکیلے ہی ہوا کرتے تھے ہم رہکر بھی لاکھوں میں

نظر بنکر مرے ارماں اُنھیں جب گدگداتے تھے
تو حوریں جھینپ جاتی تھیں ملائک مسکراتے تھے

حیاتِ شوق کی ہر سانس بس جاتی تھی خوشبو میں
خوشی سے جب دھڑکتا تھا مرا دل اُنکے پہلو میں

وہ میرا مست ہو جانا وہ اُن کا جھینپ سا جانا
وہ کھو جانا مرا وہ ہنس کے اُن کا مجھکو پا جانا

شگوفے سے چٹکتے تھے جوانی کی ترنگوں میں
رچا کرتی تھی ہولی رات دن دل کی اُمنگوں میں

متاعِ زندگانی بیخودی کی جان ہوتی تھی
گناہوں میں بھی اک معصومیت کی شان ہوتی تھی

اگر فکرِ غمِ فردا اُڑا دیتی تھی دونوں کو
محبت لوریاں دیکر سلا دیتی تھی دونوں کو

نشہ میں چور رہتے تھے اپنے سے باہر ہو کے جیتے تھے
محبت کے سوا ہم اپنا سب کچھ کھو کے جیتے تھے

خدائی بسی کیا کرتے تھے جانِ بندگی بنکر
سما جاتے تھے ہم اک دوسرے میں زندگی بنکر

وفورِ بیخودی میں ایک ہو جاتے تھے ہم دونوں
محبت لوریاں دیتی تھی کھو جاتے تھے ہم دونوں

شباب و شعر کا مفہوم جب ہم سے عبارت تھا
اسے کیا ہو گیا وہ دورِ معراجِ محبت کا

غزل:

فراقؔ گورکھپوری

راز کو راز ہی رکھا ہوتا — کیا کہنا گر ایسا ہوتا
لیکن کب تک پردہ کرتے — یعنی کب تک پردا ہوتا
آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے — آج تو کوئی آیا ہوتا
کم کم اُٹھتیں تیری نگاہیں — اکثر خونِ تمنا ہوتا
کٹتے کٹتے کٹتیں راتیں — ہوتے ہوتے سویرا ہوتا
رات کی رات دیارِ محبت — تیرا رین بسیرا ہوتا
میں ہوں، دل ہے، تنہائی ہے — تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا،
عشق نے مجھسے کمی کی ورنہ — مجھ پر تیرا دھوکا ہوتا،
پردہ داریٔ غم بھی ہے شاکی — تو نے حال تو پوچھا ہوتا
آہ یہ درد یہ بیکس حالت — آج تو اُس کو پکارا ہوتا
ہم جو تجھے کچھ بھول سا جاتے — دردِ محبت دونا ہوتا
جان گنوا کر آنکھ اُٹھا کر — حُسن کا عالم دیکھا ہوتا
یہ مایوسی یہ بیزاری — عشق کو آج تو چھیڑا ہوتا
کچھ دلِ غمگیں کر کے دکھاتا — کچھ تو زمانہ بدلا ہوتا
منزل منزل دل بھٹکیگا، — آج تمھیں نے روکا ہوتا
دنیا دنیا عالم عالم، — ہوتا عشق اور تنہا ہوتا

ہم بھی فراقؔ انساں تھے آخر
ترکِ محبت سے کیا ہوتا

فکر و نظر

(نجم آفندی اکبرآبادی)

پھر سانس کو آس اے دل ناکام ہوئی
پھر فطرتِ غم تشنۂ پیغام ہوئی
اِک شمع جلا کہ جھٹ پٹا وقت ہوا
نغمہ کو ذرا بلند کر شام ہوئی

کس سمت چلے درِ طلب کے مارے
قدرت ہے انتہا بہت شہ پارے
بس ہیں فکر و نظر کی تسکیں کے لئے
مٹھی بھر پھول آسماں بھر تارے

دونوں جانب سے شمع جلتی ہے مری
اک رات سے کم بھی زندگی اچھی ہے
تشویش بجا کہ مختصر ہے صحبت
تسکین یہ ہے کہ روشنی اچھی ہے

دل کو ہمہ تن شمعِ فروزاں کر دے
آ تکملۂ نگاہِ احساں کر دے
یہ بھی کوئی روشنی ہے اے برقِ جمال
ظلمت کو جو کچھ اور نمایاں کر دے

غزل :- ابد سرہندی

ترے حریمِ تجلی میں بار پا نہ سکا
میں چشمِ شوق کو جلوؤں سے جگمگا نہ سکا
میں کس طرح اُسے کہہ دوں خدائے عالمِ عشق؟
اُجاڑ کر مرے دل کو جو پھر بسا نہ سکا
مٹی نہ شورشِ تمیزِ کفر و ایماں کی
چراغ دیر و حرم کے کوئی بجھا نہ سکا
تو بھول کر بھی مجھے یاد کر سکا نہ کبھی
میں بھول کر بھی تری یاد کو بھلا نہ سکا
سیاہ تر تھیں مرے عہدِ ہجر کی راتیں
کہ چاند کیا کوئی تارا بھی مسکرا نہ سکا
نہ دی خودیٔ محبت نے رخصتِ سجدہ
میں آستاں پہ تمہارے جبیں جھکا نہ سکا
میں اپنے آپ کو خود بھی سمجھ سکا نہ کبھی
عجب نہیں، جو کسی کی سمجھ میں آ نہ سکا

غزل :

جگر بریلوی

ابھی دیوانگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے
ابھی اے شدتِ غم زندگی محسوس ہوتی ہے

نہ جانے زخمِ دل کی آج گہرائی کہاں پہونچی
پھٹا جاتا ہے سینہ وہ خوشی محسوس ہوتی ہے

سمایا جاتا ہو جیسے کوئی رگ رگ میں دل بنکر
یونہی غم میں کوئی شے اور بھی محسوس ہوتی ہے

شبِ تاریک ہے ویرانہ ہے محویتِ غم ہے
عجب عالم میں قربت آپ کی محسوس ہوتی ہے

ازل سے موت نے ابتک کئی قالب بدلوائے
مگر جو چوٹ تھی دل میں وہی محسوس ہوتی ہے

جہاں وہ بیٹھ جائے گر کے منزل ہے وہی اسکی
جسے ہر گام پر واماندگی محسوس ہوتی ہے

کسی کی یاد کو ہر دم بھلائے جاتا ہوں پھر بھی
کھٹکتی دل میں نوکِ خار سی محسوس ہوتی ہے

بیاباں کی کشش اب لے اڑیگی دل کے ذروں کو
کہ ہر ہر سانس پر وارفتگی محسوس ہوتی ہے

جہاں دل ضبطِ غم سے خون ہو جاتا ہے سینے میں
وہیں کچھ روح کو بالیدگی محسوس ہوتی ہے

اگر سینے میں دل رکھتے ہو تم تو آج بتلا دو
تمہیں بھی میری بیتابی کبھی محسوس ہوتی ہے

ہجومِ نامرادی سے یہ عقدہ کھل گیا آخر
جو ہوتی ہے تو غم میں زندگی محسوس ہوتی ہے

کوئی جینے کو سمجھے مایۂ عشرت برا کیا ہے
مجھے تو اک عبادت زندگی محسوس ہوتی ہے

غزل سے اے جگر اندازہ کر میری حقیقت کا
غزل میں کیفیت کچھ روح کی محسوس ہوتی ہے

طلوعِ ماہتاب

(انجم رضوانی)

وہ ہلکے ہلکے ابر میں
وہ سامنے پہاڑ پر
تجلّیاتِ حسن ہیں کہ بارشیں ہیں نور کی
کہ اطلاع ہیں کسی حسین کے ظہور کی
کہ ہو رہی ہیں جلوہ پاشیاں چراغِ طور کی
وہ سامنے پہاڑ پر
وہ ہلکے ہلکے ابر میں
وہی وہ میرے روبرو
وہ ہولناک دشت میں
پہاڑ ہے کھڑا ہوا کہ نور کا مجسّمہ
دلِ حزیں کے واسطے سرور کا مجسّمہ
کہ سامنے نگاہ کے ہے طور کا مجسّمہ
وہ ہولناک دشت میں
وہی وہ میرے روبرو

طلوعِ ماہتاب کا
سماں بھی کیا عجیب ہے
نظر فریب کس قدر ہے اُفق گُرہ پہ نور کا
نظارہ سامنے کھنچا ہوا ہے کتنی دور کا
ہے خود پرا اور کوہ پر گماں کلیم و طور کا
سماں بھی کیا عجیب ہے
طلوعِ ماہتاب کا

صلاحِ کار

(خلیل اللہ قریشی)

یہ کیسی بے حسی چھائی ہوئی ہے آج محفل پر!!؟
سکوں کا دور ہے بےکیفیوں کی حکمرانی ہے
فضائیں مست - کہساروں پہ نشہ سا - جہاں بےخود
نہ ہم بزدل کے بڑھتے حوصلوں کو پست ہونے دیں
"سزا!" "عقبیٰ!" یہ سب اوہامِ باطل ہیں میرا ذمّہ
کہاں کی آبرو؟ کیسی خرد؟ سب غرقِ مے کر دیں
"شعوری کیفیت" تک جسنے سیکھی خود فراموشی
زمانہ بھر میں لہرائیں علم جوش و مسرت کے

یہ رندانِ بلاکش کس لئے خاموش ہیں ساقی!؟
کہاں تک انتظارِ گردشِ مینا کریں ساقی؟
اور ایسے میں! ترے میخوار!! جورِ مے سہیں ساقی؟
نہ دیوانے کے "ضبطِ شوق" کا دعویٰ کریں ساقی
یہ دورِ از کار اندیشے ترے دشمن کریں ساقی
اُٹھیں - اُٹھکر پئیں پی کر گریں - گر کر پئیں ساقی
میری جانب وہی بہکی ہوئی نظریں اُٹھیں ساقی
زمانہ بھر میں نائے و نوش کی دھومیں مچیں ساقی

اسرار

(نبی احمد بریلوی)

اعتبارِ محض یہ سارا جہاں پاتا ہوں میں
اک فریبِ مستقل کون و مکاں پاتا ہوں میں

دہر کی ہر چیز کو وہم و گماں پاتا ہوں میں
ذہنِ انسانی کو خلاقِ جہاں پاتا ہوں میں

جو ودیعت کی گئی ہے سینۂ احساس میں
وہ امانت اپنے سینے میں نہاں پاتا ہوں میں

کچھ خموشیہائے اُلفت کی نہ پوچھو لذتیں
دل ہی دل میں دل کو سرگرمِ فغاں پاتا ہوں میں

رہنے دو غرقِ مئے و مینا نہ چھیڑو دوستو
اپنے کو کچھ برتر از سود و زیاں پاتا ہوں میں

سائے میں تاروں کے جب ہوتا ہوں پیمانہ بکف
اس جہاں کے ذرّے ذرّے کو جواں پاتا ہوں میں

ہے خدا جانے کہاں تک اس تسلسل کا عمل،
سارا عالم کارواں در کارواں پاتا ہوں میں

علم و دانش سے کہیں کھُلتے ہیں اسرارِ حیات
ایک ذرّے کی حقیقت بھی کہاں پاتا ہوں میں،

مے پلا ساقی کہ ہیں عقل و خرد کی یورشیں
اپنے کو پھر مبتلائے این و آں پاتا ہوں میں

یہ تصوّر ہے کسی کا یا وہ خود ہے، کیا خبر
قلب کی گہرائیوں میں کچھ نہاں پاتا ہوں میں

تُرش روئی سے کسی سے جب کوئی کرتا ہے بات
اپنے دل پر اک عجب بارِ گراں پاتا ہوں میں

غزل: بہآر کوٹی

بن گئی کافر نظر جزوِ رگِ جاں دیکھئے
ٹوٹ ہی کر رہ گیا دل میں یہ پیکاں دیکھئے

ہر کلی شیشہ بکف ہر گل خمستاں درکنار
پچھلی راتوں میں جمالِ شبنمستاں دیکھئے

اک نگاہِ فتنہ پرور اک ادائے برقپاش،
مٹ نہ جائے کاہشِ زخمِ رگِ جاں دیکھئے

جاگ اُٹھا پھر درد پھر انگڑائیاں لیں شوق نے
پھر پڑی دل پر نگاہِ فتنہ ساماں دیکھئے

دیکھنا ہی ہے اگر اندازِ استغنائے حسن
اپنا دامن دیکھئے میرا گریباں دیکھئے

چن رہے ہیں دھجیاں وہ میرے دامن کی بہآر
رنگ لایا ہے جنونِ فتنہ ساماں دیکھئے

حادثہ

(انجم رضوانی)

بندی نہ تھی پیشانیِ پر نور حسیں پر
تارا مری قسمت کا چمکتا تھا جبیں پر
بکھرا ہوا ہونٹوں پہ وہ ہلکا سا تبسم،
نکھرا ہوا سلجھا ہوا اندازِ تکلم،
اُٹھتی ہوئی چڑھتی ہوئی بھرپور جوانی
نشے میں جوانی کے وہ کچھ چور جوانی
رنگینیٔ گلزار وہ گالوں میں سمیٹے
تاریکیِ شب زلف کے بالوں میں لپیٹے
آنچل کو سنبھالے ہوئے شرماتی لجاتی
ہر گام پہ سوتے ہوئے فتنوں کو جگاتی

دنیا کی تمنائیں کچلتی ہوئی گذری
تقدیر زمانے کی بدلتی ہوئی گذری

آنکھیں تھیں کہ تابندہ سرِ عرش کے تارے
تارے تھے کہ دو برق کے بیتاب شرارے
آنکھیں تھیں کہ دو جام مئے تند سے لبریز
پلکوں سے ٹپکتا ہوا اک کیف جنوں خیز
اللہ رے نگاہوں کا تصادم سرِ راہے
ناگاہ ہوئے ہوش و خرد گم سرِ راہے
وہ شوخ وہ گستاخ وہ بیباک نگاہیں
لبریز شرارت سے وہ چالاک نگاہیں
بجلی سی لرزتی ہوئی بیتاب نگاہیں
سرسبز جوانی کی وہ شاداب نگاہیں
اٹھیں بصد انداز تبسم سرِ راہے
اور مفت میں مارا گیا انجم سرِ راہے

اس مرگِ حسیں کی کوئی فریاد نہیں ہے
فریاد کہ بیداد بھی بیداد نہیں ہے

میں سوچ رہا ہوں اور آپ بھی سوچئے

کہ کیا اس وقت ایک ایسے اخبار کی ضرورت نہیں ہے، جو صرف مسایل جنگ سے بحث کرے اور اعداد و شمار، نقشوں، کارٹونوں، تصویروں اور تحقیقی مقالوں کے ذریعہ سے ہر ہفتے لوگوں کو بتاتا رہے کہ جنگ کی موجودہ رفتار کیا ہے، آیندہ کیا کیا امکانات اس میں پوشیدہ ہیں اور ہم کو کیا پالیسی اختیار کرنا چاہئے

اگر آپ واقعی اس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور کم از کم ایک روپیہ ماہوار اس پر صرف کر سکتے ہیں، تو فی الحال آپ اس تجویز کے معاونوں میں ایک کارڈ بھیجکر اپنا نام درج کرا لیجئے —— (روپیہ بھیجنے کی ضرورت نہیں) جس وقت دو سو ناموں کی فہرست پوری ہو جائے گی اسی وقت یہ اخبار جس کا نام "**جنگ**" ہو گا جاری کر دیا جائیگا اور آپ کو اپنا ماہوار چندہ بھیجنے کی زحمت دیجائے گی

آپ خود بھی غور کیجئے، اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کا ذکر کیجئے اور مجھے بتائیے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا

یہ اخبار میری ادارت میں شایع ہو گا اور زیادہ تر میرے ہی مقالات اس میں شایع ہوں گے۔ اس کا حجم ۱۶ صفحے اور سایز بڑا ہو گا

نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (لعہ)

شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۳۴ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور یہ سلسلہ حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں۔

۱۔ چند مشہور فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کردینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا، تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عار)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶